خدا سے سوال

ڈاکٹر اختر آزاد

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

نام : اختر علی
قلمی نام : اختر آزاد
پیدائش : ۲۰رفروری ۱۹۶۶ءشام پور، پیرپینتی، بھاگلپور (بہار)
والد کا نام : محمّد حسین
والدہ کا نام : نجم انساء
تعلیم : ایم۔اے ۱۹۹۱ء، ٹاپر (رانچی یونیورسٹی، رانچی)
پی ایچ ڈی۔ ۲۰۰۷ (میرٹھ یونیورسٹی)، نیٹ (یو.جی.سی)
پہلی کہانی : 'علاج' سہ ہی ''صدف، بھاگلپور، جون تا اگست ۱۹۸۵
کُتب :
☆بابل کا مینار (افسانوی مجموعہ۔ 2000)
☆ایک سمپورن انسان کی گاتھا (افسانوی مجموعہ ۔ 2005)
☆ہم کہاں جائیں...؟ (افسانوی مجموعہ۔ہندی۔2007)
☆منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ (تنقید۔ 2007)
☆سونامی کو آنے دو (افسانوی مجموعہ۔2011)
☆لیمی نیٹیڈ گرل (ناول، اشاعت اوّل : 2013)
(ناول، اشاعت دوم : 2014)
☆خدا سے سوال (افسانوی مجموعہ۔2015)
ترتیب : ☆جمشید پور کا اردو ادب (اردو، ہندی)
ایک شمارہ جمشید پور کے نام (سہ ماہی ''ہماری آواز'' 2006، میرٹھ)
آئندہ شائع ہونے والی کُتب
☆ انوکھا شہر (ناول)
☆ لیمی نیٹیڈ گرل (ناول، ہندی)
☆ زکی انور: شخصیّت، فن اور تنقیدی مطالعہ
☆ جھارکھنڈ میں اردو افسانہ
☆ اردو افسانہ سمت و رفتار
☆ برف پگھلے گی (افسانوی مجموعہ۔ ہندی میں)
مدیر : ششماہی ''راوی'' جمشید پور، ISSN 2393 8684
خصوصی مدیر : سہ ماہی، ہماری آواز، میرٹھ، ISSN 2394 7381
گھر جنّت : نور الصّباح (اہلیہ) کائنات اختر (دختر) تابش اختر (فرزند)
پیشہ : ☆بطور پرنسپل، جواہر نواُدیہ ودیالیہ، لاہول اسپتی، کازا، ہماچل پردیش۔ 2003-05
☆درس و تدریس، شعبہء اردو، جے۔این۔وی (منسٹری آف ایچ آر ڈی، ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن، مرکزی حکومت، انڈیا) پوسٹ: بی کٹُنگ، وایا۔ ٹاٹا نگر، سی جولتا، سرائے کیلا۔83100 (جھارکھنڈ)
رابطہ۔ Dr. AKHTAR AZAD,ROAD NO-1, HOUSE NO-38,
AZADNAGAR,MANGO,JAMSHEDPUR-832110,JHARKHAND(INDIA)
E.mail: dr.akhtarazad@gmail.com Mobile:9572683122

خدا سے سوال

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر اختر آزاد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

KHUDA SE SAWAL

(Short Stories)

by

Dr.AKHTAR AZAD

Year of Edition-2015
ISBN- 978-93-5073-755-2
Rs- 300

نام کتاب	:	خُدا سے سوال (افسانوں کا مجموعہ)
مصنّف	:	ڈاکٹر اختر آزاد
مرتّب	:	منظر کلیم
سن اشاعت	:	۲۰۱۵ء
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	-/300 روپے
کمپوزنگ	:	نورالصباح
سرورق	:	تابش اختر
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street , Kucha Pundit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph: 23216162, 23214465, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اس کے نام
جس نے
سوچ قلم سے
'دنیا'
جیسی کہانی لکھی
ہمیں کردار بنایا
جینے کا ہُنر سکھایا
لیکن
صدیوں بعد
سوال اب بھی قائم ہے
کہ
کہانی ہمیں لکھتی ہے
یا ہم کہانی کو لکھتے ہیں
جواب کا انتظار ہے
دنیا کے اس پہلے کہانی کار سے
جو آج بھی
سب سے بڑا تخلیق کار ہے
☆☆☆

فہرست

☆ خدا سے سوال 9
☆ پینل انسپیکشن 19
☆ حرامی 32
☆ رئیلیٹی شو 44
☆ ہنڈیا پارہ کی ڈُمری 57
☆ پانی والا انکل 74
☆ پوتر استھل کی یاترا 89
☆ خواہشات کی اندھی گلی 103
☆ اسکین (SCAN) 114
☆ سانپ سیڑھی 125
☆ شہادت والی اُنگلی اور ٹریگر 136

خدا سے سوال

''اے عرش و فرش کے مالک! ہم فنکاروں کو وہاں جانے کا صرف ایک موقع دیا جائے۔''

خالقِ کائنات نے حیرت سے فن کاروں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔''تم سب کو لگتا ہے کہ وہاں جا کر اپنے اپنے شاہکار کو مکمل کر پاؤ گے؟''

''ہاں کیوں نہیں ______؟'' اعتماد سے لبریز آواز گونجی۔

''لیکن اتنا یاد رکھو کہ جس زمانے میں تم سب جی رہے تھے، اُس میں اور آج میں بہت فرق ہے۔قدریں بدل چکی ہیں۔نئی نسل کے ساتھ مل کر کام کرنا اتنا آسان نہیں، جتنا تم سب سوچ رہے ہو۔نا کامی کی صورت میں جنّت سے نکالے بھی جا سکتے ہو۔''

''ہمیں امیّد ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔قدریں جتنی بھی بدل جائیں۔آخر وہ نسل ہماری ہے۔اُن کی رگوں میں ہمارا ہی خون دوڑ رہا ہے۔اور وہ سب بھی یادگار کے طور پر اپنے آباء واجداد کی قدروں کو سہیج کر رکھنا چاہیں گے۔اس لئے زمین پر جانے کا ایک موقع دیا جائے تا کہ ہم سب اپنے خوابوں میں حقیقت کے رنگ بھر سکیں۔امر ہو سکیں۔''

''جب تم سب اپنی ضد پر ہو..........تو جاؤ! تمہیں وہ موقع دیا جاتا ہے۔''

☆

ہر کسی کی آنکھوں میں کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جس کی وہ تعبیر چاہتے ہیں۔لیکن اگر کسی وجہ سے یہ چاہت پوری نہیں ہوئی اور خواب بے رنگ ہو گئے تو یہ خواہش ہمیشہ اُن

کے اندر جواں رہتی ہے کہ اُن کے بعد کی نسل اُن خوابوں میں حقیقت کے وہ سارے رنگ بھر دے جو اُن کی آنکھوں نے کبھی دیکھے تھے..........اس خواہش میں کبھی وہ پیار کا سہارا لیتے ہیں، کبھی دباؤ بناتے ہیں اور کبھی زبردستی اُنہیں وہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں، تا کہ مر کر بھی وہ اپنی نسل کے لہو میں زندہ رہ سکیں۔

اپنے فن میں ماہر چند فنکاروں نے بھی کچھ ایسے ہی خواب دیکھے تھے کہ وہ شاہکار کی تخلیق کریں گے..........لیکن ان کے یہ خواب ادھورے رہ گئے۔

قلم کار نے ناول کے لئے ایک اَن چھوئے موضوع کا انتخاب کیا تھا۔

سنگ تراش نے نایاب سفید پتھر کو تراش خراش کر اپنے فن کا بہترین مظاہرہ دکھانا چاہا تھا۔

آرٹسٹ نے دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ کی تصویر کو کینواس پر اتار کر اُس میں قوس وقزح کے رنگ بھرنا چاہا تھا۔

اس طرح ہر پیشے سے محبّت کرنے والے فنکار اپنے شاہکار کی جلوہ گری سے کائنات کو مزین کر کے رہتی دنیا تک باقی رہنا چاہتے تھے۔لیکن جیسے جیسے کام آگے بڑھتا گیا ویسے ویسے شک وشبہات جنم لیتے رہے کہ جس موضوع کو اَن چھوا سمجھ کر وہ شاہکار تخلیق کی بنیاد رکھنے جا رہے ہیں، کہیں اُس سے پہلے کے فن کار اُس پر اپنے علم کا جوہر دکھا چکے ہوں تو.........تو پھر اُن کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔پھر کیا تھا:قلم کار کی انگلیوں کی پکڑ کمزور پڑ گئی اور موضوع قلم کی نوک سے پھسل کر کاغذ پر اپنا چہرہ کھونے لگا۔ہتھوڑی اور چھینی سے پتھر کے جسم کو آ کار دینے والے سنگ تراش کے اوزار کی دھار بھی کُند پڑنے لگی۔رنگ اور برش کے حسین امتزاج سے کینواس پر دنیا کے سب سے خوبصورت نظارے کو زندگی دینے والے آرٹسٹ کے ہاتھوں میں لرزہ طاری ہو گیا.........شاہکار تخلیق مکمل ہونے سے پہلے ہی دم توڑنے لگی۔فنکار چاہ کر بھی مکمل نہیں کر پائے اور افسوس کی ردا میں لپٹ کر ایک ایک کر کے دنیا سے کوچ کرتے چلے گئے۔

لیکن آسمان کے اُس پار بھی اُنہیں سکون نہیں ملا۔وہ خواب اُنہیں بے چین کرتے رہے۔شاہکار تخلیق کی یاد ستاتی رہی۔یاد کی یہی وہ کڑی تھی جو زمین و آسمان کو مضبوطی سے جوڑے ہوئے تھی۔اِس لئے اکثر وہ آسمانی جھروکوں سے نیچے جھانک لیا کرتے تھے۔وہ جب بھی آسمانی دوستوں سے اپنے زمینی رشتہ داروں کا تعارف کرواتے تو اُنہیں ایک طرح کی طمانیت سی محسوس ہوتی۔

لیکن جیسے ہی انٹرنیٹ جیب میں سمانے لگا۔چلتی پھرتی تصویریں دکان سجانے لگیں۔لڑکیاں لیمینیٹ ہوکر بازار کی رونق بڑھانے لگیں۔موڈرنیٹی کے جسم پر تہذیب و تمدُّن کے کپڑے کم پڑنے لگے۔نشیلی اور جنسی دوائیں سیلف کی زینت بننے لگیں۔اچھائی اور سچائی کی پہچان دھند لکے میں گم ہونے لگی تو وہ سوچنے لگے کہ کیا اب کسی اَن چھوئے موضوع پر کسی اَن چھوئے خیال کو شاہکار کا جامہ پہنا کر اُن کی نسل آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا پائے گی ....رشتے کی یہ کڑی وہاں کچھ کمزور پڑتی نظر آنے لگی تھی۔جھروکوں پر اُن کا آنا کچھ کم ہو گیا تھا۔نیچے جھانکتے ہوئے کراہیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔یہی وجہ ہے نامکمل شاہکار کا کرب اُن کے چہرے پر اب اور بھی گہرانے لگا تھا۔بے چینی تھی کہ اندر سرایت کرتی جارہی تھی کہ اگر کچھ اور دیر کی تو اقدار کی سرزمین پر سوچ کی کھائی کچھ اور بڑھ جائے گی۔اس سے پہلے کہ نئی نسل بھول جائے، وہ وہاں جائیں اور اپنے شاہکار کو مکمل کرنے کی جستجو میں جُٹ جائیں۔

پھر جب ایک دن تمام فنکاروں نے گوش گزار کیا کہ اُنہیں ایک موقع دیا جائے تاکہ وہ زمین پر جاکر نئی نسل کے ہاتھوں اپنے شاہکار کو اصلی چہرہ دے سکیں تو خالقِ کائنات نے اُن کی باتوں پر غور کیا اور انہیں بطور انعام دُنیا میں جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ اپنے ادھورے خواب مکمّل کرسکیں۔

آدم وحوّا کو بھی زمین پر اسی مقصد کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا۔اگر نہیں بھیجا گیا ہوتا تو خالقِ کائنات کا سب سے بڑا شاہکار اب تک تاریکی میں ڈوبا ہوا ہوتا۔اشرف

المخلوقات کو کون پوچھتا......؟

دیکھتے ہی دیکھتے خواب منتقل کرنے کا دن آن پہنچا______

آسمان کی کھڑکیوں سے فنکار زمین کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ اب جلد ہی اُن کے ادھورے خواب پورے ہو جائیں گے۔ وہ شاہکار جو ادھورا رہ گیا تھا، کسی اور کے ذہن میں منتقل ہوتے ہی مکمّل ہو جائے گا۔

ادھورے سے مکمّل ہونے کا یہی وہ مشترکہ احساسِ درد ہے جس کی بنیاد پر کائنات ٹکی ہوئی ہے۔ فنکار خلا کے زینے کو پار کر کے ہواؤں کی سیڑھیوں سے نیچے اُترتے رہے۔ گھر گھر جھانکتے رہے کہ کوئی مل جائے تو وہ اپنے خواب منتقل کر سکیں۔ لیکن سب کے سب انٹرنیٹ کی دنیا میں جاگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود نہ کوئی ان کی طرف متوجہ ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی کو اُن کی پرواہ تھی۔ ایسے میں وہ اندر سے ٹوٹنے اور بکھرنے لگے تھے کہ کہیں اُن کے یہ خواب ادھورے رہ گئے تو..........تو پھر وہ شاہکار جس کی اُنہوں نے صدیوں تمنّا کی تھی، کبھی وجود میں نہیں آئے گا۔ اور پھر قیامت در قیامت اُنہیں اسی اذیت سے گذرتے رہنا پڑے گا۔

وقت پہلے کی طرح ہی گذر رہا تھا.........

طئے شدہ پروگرام کے مطابق اُنہیں چوبیس گھنٹے کے اندر سورج نکلنے سے قبل اپنے خواب منتقل کرنے تھے اور ایک ماہ کے اندر اپنا کام پورا کر کے واپس لوٹ جانا تھا۔

وہ سب مضطرب و پریشاں زمیں کے چکّر کاٹتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے مکانات نے فلک بوس عمارتوں کی شکل لے لی تھی۔ جگہ تلاش کرنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ سب تھک گئے تھے۔ اب تھکے ہارے خوابوں کو بے چین آنکھوں میں سمیٹے آسمان کی طرف کوچ کرنے والے تھے۔ لیکن ناکام لوٹنے کی صورت میں اُنہیں جنّت سے نکالا جا سکتا ہے۔ اُن کے ہوش و ہواس گُم ہونے لگے تھے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ جسم موم میں ڈھلنے لگا تھا اور آگ کی لپٹیں اُن کی طرف تیزی سے بڑھنے لگی تھیں......اس سے قبل کہ سوچ کا

وجود پگھلتا اُنہوں نے خود کو مجتمع کیا اور حوصلے کے پنکھ لگا کر ایک بار پھر تیزی سے چکّر کاٹنے لگے۔

چکّر کاٹتے رہے..........

اچانک ایک قلم کار کے کمرے کی گُل روشنی نے آسمانی قلم کار کے پژمردہ چہرے پر اُمیّد کی افشاں چھڑک دی۔

صدیوں سے یہ زمینی قلم کار بھی کسی اَن چھوئے موضوع کی تلاش میں تھا۔ اور اس تلاش میں اس نے پوری دنیا چھان ماری تھی اور آخر کار ایک اَن چھوا موضوع اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ صدیوں کی اِس مسافت کے بعد وہ آج بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے چند اوراق لکھنے کے بعد وہ قلم اور کاپی بیڈ پر رکھ کر سو گیا تھا کہ یکا یک قلم میں جنبش ہوئی اور اوراق اُلٹنے لگے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اُٹھتا، اپنے بازو پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ اتنی رات گئے میرے کمرے میں کون ہوسکتا ہے.........؟ اس نے تو کمرہ ٹھیک سے بند کیا تھا۔ پھر کوئی اندر.....؟'' ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لمس دباؤ میں بدل گیا۔ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''کون..........؟'' اس نے بتّی جلائی۔

''تم نے مجھے نہیں پہچانا..........کبھی میں اپنے وقت کا سب سے بڑا قلم کار تھا۔''

اُس نے اپنے ریڈنگ روم کی دیواروں پر بے شمار شعراء و ادباء کی تصویریں چسپاں کر رکھی تھیں۔ اُن کی پیدائش اور موت کے ساتھ ساتھ اُن کی تخلیقات کا ذکر بھی حاشیے میں درج تھا۔ اس لئے وہ فوراً اس کی پہچان کے رڈار میں آ گئے۔

'' بابائے افسانہ! آپ اور اتنی رات ....'' عقیدت سے اُس کا سر جھک گیا۔ ''خبر کر دیتے تو میں ہی آپ کے پاس آ جاتا۔''

''نہیں تم میرے پاس نہیں آ سکتے۔ کیوں کہ تم زندوں میں سے ہو۔''

'اوہ! میں تو یہ بھول ہی گیا تھا۔ آنے کا کوئی خاص سبب.........؟'' مسکراتے ہوئے اُس نے آگے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی کتاب آسمان میں شائع ہوئی ہو اور آپ اُسے پرموٹ کرنے یہاں آئے ہوں۔''

''پرموٹ ورموٹ تو نہیں۔لیکن یہاں آنے کا ایک خاص سبب ضرور ہے۔خالقِ کائنات نے مجھے اپنے ادھورے شاہکار کو مکمل کرنے کے لئے تمہارے پاس بھیجا ہے۔آج تمہاری قسمت بدلنے والی ہے۔کیوں کہ آج تم وہ لکھو گے جو میں لکھواؤں گا۔''

اور پھر اُنہوں نے اپنے شاہکار خواب کے موتی جیسے چمکتے لفظ ایک ایک کر کے اُس کے سامنے رکھ دیئے.........

''واہ! بہت خوب......میرے ناول کا موضوع بھی یہی ہے۔'' وہ چہک اُٹھتا ہے۔پھر کچھ رک کر کہتا ہے۔''بس کلائمکس میں تھوڑا فرق ہے۔آپ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کی خوبصورتی کو چھپانے کے لئے اُس کے ننگے جسم پر سر سے پیر تک کپڑے پہنا رہے ہیں تا کہ کسی کی نظر نہ لگے_____اور میں اس کے نشیب وفراز کو عیاں کرنے کے لئے اس کے مرمریں جسم سے ایک ایک کپڑے اُتار رہا ہوں تا کہ دنیا کا ہر شخص خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی بے مثال خوبصورتی کو آنکھوں کے راستے روح میں اُتار سکے۔''

☆

تلاش کا سلسلہ پہلے کی طرح ہی جاری تھا______

تمام فنکار اپنے جیسے کسی فنکار کی تلاش میں محو تھے۔کچھ کو کامیابیاں بھی مل رہی تھیں۔

قلم کار کے بعد آرٹسٹ وہ خوش قسمت فنکار تھا جنہیں وہ آرٹسٹ مل گیا جس کی اُنہیں تلاش تھی۔ساتھ ہی ساتھ دنیا کی وہ خوبصورت جگہ بھی جس کا وہ دیوانہ تھا اور جسے شاہکار میں ڈھالنا چاہتا تھا_____زمینی آرٹسٹ ہاتھ میں رنگ اور برش لئے کینوا اس کے سامنے جھکا ہوا تھا۔یہ دیکھ کر اُنہیں اچھا لگا کہ کوئی تو ایسا ہے جو اُن کی طرح سوچ رکھتا ہے۔جلد سے جلد اپنی سوچ منتقل کرنے کی خواہش میں وہ اُس کے بغل گیر ہو گئے۔

''ہائے۔''

''کون_____؟''

''میں.........'' اُنہوں نے پہاڑی نظاروں کو داد بھری نگاہوں سے دیکھا اور

آ گے کہا۔ ''میں نے ہی سب سے پہلے اس خوبصورت نظارے کا انتخاب اپنے کینواس کے لئے کیا تھااور سوچا تھا کہ اس میں کچھ ایسے رنگ بھروں گا کہ اس کے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔ میں پینٹنگ کی دنیا میں اس نظارے کو ایک شاہکار کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔لیکن کسی وجہ سے مکمل نہیں کر پایا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے اُس آئیڈیا کو تم سے شیئر کروں تا کہ تم اُسے شاہکار میں بدل سکو۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ یہ تو بہت اچھّی بات ہوگی کہ مجھے آپ جیسے مہان آرٹسٹ کے مارگ درشن میں کام کرنے کا موقع ملے گا۔''

اور پھر جب آسمانی آرٹسٹ نے اپنے شاہکار کا آئیڈیا شیئر کیا تو وہ مسکرایا اور بولا

''سب کچھ تو ویسا ہی ہے جیسا میں نے سوچا ہے۔لیکن یہ جو آپ ٹیلے سے سورج نکلتے ہوئے دکھانا چاہتے ہیں وہاں میں اُسے ڈوبتے ہوئے دکھاؤں گا،اور اس ٹیلے کے نیچے اس ہرے بھرے میدان میں جہاں آپ امن کی خاطر الگ الگ مذاہب کے لوگوں کو سرودھرم پرارتھنا کرتے ہوئے دکھانا چاہتے ہیں، وہاں میں خوبصورت لڑکیوں کے پیروں میں گھنگھرو اور ہونٹوں پر سُر کی لالی لگا کر اوپن سیکس وپیکج ڈیولَپ کروں گا۔ کیوں کہ کیمرہ، لائٹ اور ایکشن کے ٹین ایج انٹرنیٹ بازار میں سب سے زیادہ پیسہ اب اِنہی ویلیجوں میں اُگنے لگا ہے۔''

☆

تلاش کا سلسلہ ہنوز جاری تھا______

فنکار اپنے جیسے کسی فنکار کی تلاش میں اب بھی سرگرداں تھے۔

آسمانی سنگ تراش کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا، جب اُس نے چلتے چلتے ایک جواں سال سنگ تراش کو کچرے کے ڈھیر سے پتّھر نکال کر صاف کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے وہاں رُک گیا۔ پتّھر کو ٹرالی میں رکھ کر جب پاس سے گذرا تو اُس کی آنکھیں نایاب پتھر کو دیکھ کر چمک اُٹھیں۔ وہ اُس کا پیچھا کرتے کرتے ورک شاپ تک پہنچ گیا اور ٹرالی سے پتھر اُٹھا کر نیچے رکھنے میں اُس کی مدد کی۔ نو جوان سنگ تراش ایک انجان

شخص کو اپنے لئے پتھر اُٹھاتے دیکھ کر حیران تھا۔ اِس حیرانی پر آسمانی سنگ تراش کے ہونٹوں پر تبسّم ریز کلیاں کھل گئیں۔

''کون ہو بھائی! آج پہلی بار کسی انجان نے پتّھر رکھنے میں اِس طرح میری مدد کی ہے۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی نہیں اپنی مدد کی ہے۔''

''بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ شکل سے فنکار لگتے ہو۔''

''ہاں ہوں تو فنکار ہی۔ تم نے برخوردار! مجھے ٹھیک پہچانا۔ میں وہی بدقسمت سنگ تراش ہوں جس نے اِس نایاب پتھر کو لازوال شاہکار میں بدلنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن کیا کہوں؟ بڑی محنت کی۔ پسینہ بہایا۔ خون جلایا۔ پھر بھی ناکام رہا۔ اب جب تم اِس پتھر کو آکار دینے کے لئے کچرے کے ڈھیر سے اُٹھا لائے ہو تو وہ خیال جو اِس سے پہلے کبھی کسی مورت میں تبدیل نہیں ہوا، میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میرے خیال میں جان ڈال دی، تو میرے ساتھ تم بھی اَمر ہو جاؤ گے۔''

''اچھا! ایسی بات ہے تو ہم بھی سنیں کہ وہ کیا خیال ہے جو پتھر کو شاہکار کا درجہ دلا سکتا ہے ______'' نوجوان سنگ تراش کی مسکراہٹ میں مزاح کا پہلو نمایاں تھا۔

''تم میری بات پر بھروسہ کرو۔''

''مجھے انکار نہیں ہے۔ پہلے اپنا خیال پیش کریں۔''

پھر اُنہوں نے شاہکار خیال کی سنہری پرتیں ایک ایک کر کے کھول کر رکھ دیں....

''یار! تم نے تو میرا دل جیت لیا ہے۔ میرے اور تمہارے خیال میں بہت زیادہ یکسانیت ہے۔'' نوجوان سنگ تراش نے اس نایاب پتھر کو چھوتے ہوئے آگے کہا۔ ''لیکن دوست جس کے اندر تم پاکیزگی کی روح ڈال کر آنکھوں میں اپنائیت اور ہونٹوں پر ممتا کی ایک ایسی مسکراہٹ ڈالنا چاہتے ہو تا کہ جب بھی کسی کی نظر اُس پر پڑے تو اُسے اپنی ماں یاد آ جائے ______ لیکن میں اُس کے اندر دنیا کی شہوانیت بھر کر آنکھوں میں نشہ اور مدھ بھرے

ہونٹوں پر اِتنا رس نچوڑنا چاہتا ہوں تاکہ جب بھی کوئی دیکھے تو وہ گوشت پوشت کی حسینہ کو چھوڑ کر اُس قدِ آدم مورت کو پہلو میں بھرنے کے لئے بے تاب ہو جائے۔''

☆

تلاش کا سلسلہ بدستور جاری تھا______

دوسرے فنکار نئی نسل سے ملتے رہے۔ نئی نسل جدید عہد کی خواہشات کے مدِّ نظر ان خوابوں میں تبدیلیاں رونُما کر کے لازوال سے بھی آگے نکل جانے کی چاہت میں شب و روز کوشاں نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے درمیان وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی۔ آسمانی فنکار تضاد کا شکار ہو گئے۔ دوبارہ شاہکار کو وہ شکل نہیں دے سکے، جس کے وہ متمنی تھے۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب تمام فنکار ایک ایک کر کے آسمان کی طرف لوٹنے لگے۔ خالقِ کائنات ان دنوں بے حد مصروف تھے لیکن انہیں اپنے علم سے سب کچھ معلوم تھا کہ ان فنکاروں کے ساتھ زمین والوں نے کیسا برتاؤ کیا لیکن اس کے باوجود وہ اُن کی زبان سے سُننا چاہتے تھے۔ اس لئے دربار سجایا گیا۔ جب وہ مخصوص جگہ پر جلوہ افروز ہوئے تو تمام فنکار سجدہ ریز ہو گئے۔

خالقِ کائنات نے پوچھا۔

''فنکارو! تم سب خوش نصیب ہو کہ موت کے بعد بھی تمہیں اپنے اپنے شاہکار کو مکمل کرنے کا موقع ملا۔ اب ایک ایک کر کے سامنے آؤ اور اپنا اپنا شاہکار دکھاؤ۔''

چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا۔ کوئی سامنے نہیں آیا۔

''آخر اس خاموشی کا سبب کیا ہے؟ کیا تم سب اپنی نسل کے ہاتھوں شاہکار کو مکمل کرنے میں ناکام رہے........؟''

ایک بار پھر چاروں طرف خاموشی چھائی رہی۔

اور جب اس بار بھی سامنے آنے کی ہمّت کوئی نہیں جُٹا سکا تو خالقِ کائنات کا برہم ہونا لازم تھا۔ زوردار آواز گونجی۔

''تمہیں ایک اور آخری موقع دیا جاتا ہے۔لیکن اتنا یاد رکھو کہ حکم عدولی کرنے والوں کو اِسی وقت دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔اگر تمہارے پاس شاہکار نہیں ہیں تو بھی اُٹھو اور اپنا تجربہ بیان کرو...........''

خالق کائنات کے جاہ وجلال کو دیکھ کر خوف کے مارے فنکاروں کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں ۔زبان بھی گنگ ہونے لگی کہ وہ کون سا شاہکار دکھائیں ....اور کیسا تجربہ بیان کریں ....؟ شاہکار تو تھا نہیں اور جو تجربہ تھا وہ بھی تلخ تھا۔تلخ تجربے کو سننے کے لئے خالقِ کائنات نے اتنا شاندار دربار سجایا نہیں ہوگا۔اگر سنیں گے تو پہلے ہی قیامت آجائے گی......نہیں سنانے کی صورت میں حکم عدولی کا الزام اُن سب کے سر جائے گا۔اِس سے بہتر ہے کہ حقیقت بیان کردیا جائے۔

پھر سب نے حوصلہ جمع کیا۔ہمّت کرکے سامنے آئے۔ڈرڈر کر ہی سہی لیکن اپنی بات رکھی.........سب کے تجربے کالبِ لباب یہ تھا کہ ہم نے جاں توڑ کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

وہ خاموشی سے سب کی سنتے رہے۔

جب آخری فنکار اپنا تجربہ بیان کر چکا تب خالقِ کائنات نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

''اِن فنکاروں کو جس مقصد کے تحت زمین پر بھیجا گیا تھا اس میں یہ ناکام رہے ہیں۔اس لئے ایک ایک کو دوزخ میں ڈالا جائے۔''

خاص درباری جو اس کام کے لئے معمور تھا،وہ حکم کی تعمیل میں آگے بڑھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ درباری اُن تک پہنچتا اور ایک ایک کو گھسیٹ کر لے جاتا،اس سے پہلے اس سوال کا جواب تلاش کرتے سارے فنکار دوزخ کی طرف بڑھ گئے۔

''بے شک آپ ہمارے خالق ہیں۔جہاں چاہیں رکھیں______ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ کیا پوچھنا ہے اور کیا نہیں؟ لیکن اس کے باوجود اگر ہو سکے تو یہ بتائیں کہ آپ کی موجودگی میں قدریں اتنی تیزی سے کیسے بدلیں کہ ''عریانیت'' جدید عہد تک آتے آتے ''شاہکار'' بن گئیں؟''

☆☆☆

پینل انسپیکشن

انسپیکشن کی خبر جیسے ہی ای۔میل سے باہر نکلی کیمپس میں افراتفری مچ گئی۔
کچھ ہی دیر کے بعد پرنسپل نے ہنگامی میٹنگ طلب کی۔ابھی میٹنگ شروع ہونے والی تھی کہ ایک معصوم سا چہرہ ہاتھوں میں فائل لئے دروازے کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ پاؤں میں معمولی چپّل۔جسم پر سادہ لباس۔آنکھوں میں موٹے فریم کا چشمہ۔قد بہ مشکل پانچ فٹ کی برابری کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

''مے آئی کم اِن سر......؟'' ہاتھ آگے بڑھا کر حلف لینے والے انداز میں گویا ہوا۔
پرنسپل نے اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔''کہئے کیا کام ہے؟''
''جی میں وکاس کمار رائے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے باہر بیٹھئے۔میٹنگ کے بعد دیکھیں گے کہ بچّے کا کیا پرابلم ہے۔'' پرنسپل نے بے توجّہی سے کہا۔اُنہیں لگا کہ دسویں کلاس کے وکاس منڈل کے گارجیئن ہیں، جسے موبائل رکھنے کے جرم میں کل ہاؤس ماسٹر نے پکڑا تھا۔خبر ملتے ہی پہنچ گئے ہیں معافی نامہ لکھ کر معاملہ کو رفع دفع کرنے اور قیمتی موبائل واپس لے جانے۔

''جی! پرابلم کچھ بھی نہیں۔میں تو ہندی شکچھک کے روپ میں یہاں اپنا یوگیہ دان دینے آیا ہوں۔'' فائل کے ساتھ ہاتھ جوڑتے ہوئے اُنہوں نے اس طرح کہا جیسے ٹرین پکڑنے کی جلدی ہو۔ٹیچروں کے چہرے پر ہنسی رم جھم سی برسات کر گئی۔کچھ نے آنکھوں کے فیتے سے اُنہیں سر سے پیر تک ناپنے کی کوشش کی۔

''آیئے، آیئے، آپ کا سواگت ہے۔''پرنسپل نے مسکراتے ہوئے خالی کرسی کی طرف اِشارہ کیا۔

''جی بہُت بہُت دھنیہ واد۔''سمٹ کر کرسی پر بیٹھتے وقت بھی اُنہوں نے ہاتھ جوڑے رکھا۔

وائس پرنسپل جو پاس ہی بیٹھے تھے۔کہا۔''ارے بھئی سمٹ کر نہیں پھیل کر بیٹھئے، کیوں کہ آپ سنٹرل کی نوکری جوائن کرنے آئے ہیں۔ہم سب داماد ہی تو ہیں گورنمنٹ کے۔سال میں دو بار مہنگائی بھتّہ لیتے ہیں۔لیکن 'شکچھا' جیسی بیٹی کو ٹھیک سے نہیں رکھنے کے جرم میں پینل انسپیکشن ہوتا ہے۔اور ہر سال ہماری کھال میں 'میمو' کا بھوسا بھرا جاتا ہے۔آپ بہُت اچھّے ٹائم پر آئے ہیں۔آتے ہی انسپیکشن کی مار........؟''ٹھہا کہ لگاتے ہوئے آگے کہا۔''کیوں پرنسپل صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

وائس پرنسپل جن کا کچھ ہی ماہ قبل یہاں ایڈمنسٹریٹیو ٹرانسفر ہوا تھا۔انہوں نے طنز و مزاح کا کوکٹیل حلق کے اندر اُتارنے کی کوشش کی تو نچلے ہونٹ کے اندر دبی کھینی لفظوں کے لُعاب سے پھسل کر باہر نکل آئی جسے انہوں نے جلدی سے اندر کر لیا۔ٹیچروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ اس طرح کی باتوں سے اسکول کا اِمیج خراب ہوتا ہے۔لیکن وہ ایکس پرنسپل کی شکایت پر ہوئے ٹرانسفر سے خوش نہیں تھے۔اس لئے منفی سوچ کے ساتھ جوائن کیا تھا کہ موجودہ پرنسپل کو اتنا تنگ کریں گے کہ وہ اُن کی شکایت ڈی ڈی سے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔پھر کیا: خود بخود ٹرانسفر ہو جائے گا اور ایک بار پھر یہاں سے ایڈمنسٹریٹیو ٹرانسفر بینیفٹ لے کر کہیں اور چل دیں گے۔

پرنسپل نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

''وائس پرنسپل صاحب! یہ آپ کیا لے کر بیٹھ گئے۔ابھی ابھی آئے ہیں۔ذرا سانس تو لینے دیجئے۔''

پھر وکاس کمار رائے سے بولے۔''میٹنگ کے بعد آپ کی جوائننگ ہو جائے

گی۔ تب تک آپ یہیں بیٹھیں۔''

اس کے بعد میٹنگ شروع ہوئی.........

''میرے لرنیڈ کلیگ ! ابھی کچھ دیر قبل ہی ڈپٹی ڈائریکٹر کا ای۔میل آیا ہے۔ ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر اور تین پرنسپل کے ساتھ آرہے ہیں۔ پانچ سے سات جنوری تک ان کا یہاں کیمپ ہوگا۔ ایک دن پہلے آئیں گے۔ لیکن واپسی سات جنوری کی شام کو ہوگی۔ ہمارے یہاں لاسٹ ایئر کا ریزلٹ ٹینتھ اور پلس ٹو کا بہت اچھا نہیں رہا ہے۔ اس لئے گاج گرسکتی ہے۔ اس کا اِنڈی کیشن ڈی۔ ڈی صاحب نے پرنسپل کانفرنس میں دے دیا تھا۔ جس کا ذکر میں نے آتے ہی کیا تھا۔ آج دو تاریخ ہے۔ بس دو دن ہاتھ میں ہے۔ اپنی اپنی ذمّہ داری سمجھ لیں۔ اپنا اپنا رجسٹر مینٹین کرلیں۔ جہاں کہیں سائن چھوٹ گیا ہو کروالیں تاکہ ڈی۔ ڈی صاحب کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے.......'' چند ثانیے کے لئے رُکتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ ''ویسے آپ سب ڈی۔ ڈی صاحب کے مزاج سے تو واقف ہی ہیں۔ ذرا سی اونچ نیچ پر بھی نارتھ ایسٹ بھیج دیتے ہیں۔''

''اور سر جو نارتھ ایسٹ کاٹ چکا ہے اُسے ....جیسے کیمسٹری سر، فزکس سر..........؟'' سینیئر موسٹ نے مذاق کا سہارا لیا۔

''اگر وہ چاہ لیں تو پھر کسی بھی جگہ کو نارتھ ایسٹ بنا سکتے ہیں.......ہم سب اُن کے ادھین ہیں۔ اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں.......؟ آؤٹ پُٹ اور بس.......ہم کام بھی نہیں کرنا چاہتے اور 'ریوارڈ' کی بھی تمنّا رکھتے ہیں؟'' دو چار ٹیچروں پر یہ طنز کا زبردست وار تھا۔

''سر اُسی ریوارڈ کا تو نتیجہ ہے کہ مجھے گھر سے دو ہزار کیلومیٹر پھینک دیا گیا۔'' وائس پرنسپل کی آواز میں گھر سے دور ہونے کا درد صاف جھلک رہا تھا۔

''دیکھئے اب یہ رونا دھونا چھوڑیئے اور تیّاری میں لگ جایئے۔ ڈی۔ ڈی صاحب کا موڈ اگر ٹھیک رہا تو میں آپ کے ٹرانسفر کی سفارش کردوں گا۔ اگر ایک بار میں نے ان سے کہہ دیا تو سمجھ لیجئے آپ کا کام ہوگیا۔ اس لئے سر یسلی انسپیکشن کا کام دیکھئے۔ باقی

مجھ پر چھوڑ دیجئے۔''

پرنسپل کے اس لالی پاپ کے ساتھ ہی وائس پرنسپل کے منہ میں مٹھاس گھلنے لگی تھی۔

وائس پرنسپل سفارشی کلمات کے عِوض پہلی بار ایکشن میں نظر آئے اور اسپیشل روٹین بنانے اور اکاڈ مک رکارڈ تیّار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر کی مشقت کے بعد وہ سینئر موسٹ ٹیچر کی مدد سے سہ روزہ روٹین بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ایسا کر کے انہوں نے پرنسپل صاحب کی حمایتی ٹولی میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

دوسری طرف سبھی ٹیچر اپنی ذمہّ داریوں کو رگڑ کر چمکانے میں لگے ہوئے تھے........

کہیں سے سواگت گان کی آواز آ رہی تھی تو کہیں پینٹنگ کو جھاڑ پونچھ کر کے سجانے کا کام جاری تھا۔ کہیں بچّوں کے امتحان سے متعلّق ریکارڈز سہیج کر رکھے جا رہے تھے۔ تو کہیں اِنوول کلینڈر کے فارمیٹنگ کا کام کمپیوٹر پر چل رہا تھا۔ سی۔سی۔اے انچارج کلچرل پروگرام کی تصویریں اور رپورٹنگ چپکانے میں جہاں مصروف تھے وہیں لائبریرین کتابوں کو ترتیب سے رکھنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں جیسے نیشنل لائبریری کو ری مورڈی فائی کرنے کا ذمہّ انہیں سونپا گیا ہے۔ اسکارٹ اینڈ گائیڈ اور این۔سی۔سی ڈیپارٹمینٹ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جنون میں ریہرسل کے لئے بچّوں کو بھوکے پیاسے مارچ پاسٹ کے چٹیل کھیتوں میں جوت رہے تھے۔ میدان میں نئے سرے سے مارکنگ اور چونا گرانے کا کام بھی وار پیانے پر ہو رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ریکارڈ تیّار کر لئے گئے۔ سب نے ایک دوسرے کی مدد کی کہ ایک کی کمزوری دوسرے ڈیپارٹمینٹ کی اچھّائی پر پانی نہ پھیر دے۔ ویسے ٹیچرز بچّوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے رات دن کوشاں تھے۔ لیکن جب ایک بچّے کی خراب کارکردگی پر پرنسپل سے شوکاوَز مانگا گیا، تب ٹیچروں نے ''بچّے کی ذہنی حالت کو فوکس کرنے کا'' مشورہ دیا تھا جسے پرنسپل نے درکنار کر دیا۔ جس کے باعث من موٹاؤ پیدا ہوا۔ لیکن اب ٹیچرز تلخیوں کو بھول کر امتحان کے میدان میں کود پڑے تھے۔

پرنسپل نے انسپکشن سے ایک روز قبل میٹنگ بلائی اور دورانِ گفتگو ہدایت کی چائے پلاتے ہوئے کہا۔

''استقبال میں کسی طرح کی کوئی نہیں ہونی چاہئے۔میوزک میڈم کی یہ ذمّہ داری ہے کہ وہ سُر کی زنجیروں میں جکڑ کر نغمگی کا رس کچھ اس طرح پلائیں کہ کمیوں کی کڑواہٹ سے بھی شیرینی چھلکنے لگے۔''

''جی سر!''

''ابھی آپ پروبیشن میں ہیں۔اس لئے ڈانس بھی ایسا ہو کہ وہ منتر مُگدھ ہو جائیں۔سمجھیں نا.......؟''

'' آپ بےفکر رہیں سر! میرے رہتے ہوئے کلچرل پروگرام کبھی پھیکا پڑا ہے کیا.......؟''

پھر انہوں نے سینئر موسٹ جو اسمبلی انچارج تھے ان سے کہا۔

دیکھئے! اسمبلی بھی گریس فُل ہونا چاہئے۔ویسے کل کس ہاؤس کی اسمبلی ڈیوٹی ہے؟''

''سر، جونیئر بوائز کی۔''

''آپ ایسا کریں کہ اسمبلی ڈیوٹی چارٹ کو نئے سرے سے اس طرح فریم کریں کہ اس ہفتے کی ڈیوٹی خود بخود سینئر گرلس کے حصّے میں آجائے۔آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات........؟''

''جی سر، لاسٹ ایئر بھی ہم لوگوں نے یہی کیا تھا اور اُنہیں لگا تھا کہ ہماری اسمبلی نارمل ٹائم ٹیبل کے مطابق چل رہی ہے۔بہُت اچھا اِمپریشن پڑا تھا سر اُس بار........بس آپ پھولوں کا گلدستہ، شال وال کا انتظام کر لیں اور تعریف کے لئے لٹریچر والوں سے دو چار خوبصورت شعر لے لیں۔بس سمجھئے کام ہو گیا۔'' سینئر موسٹ نے اُن کے منصوبے پر مسکراہٹ کی مہر لگاتے ہوئے اپنی رائے سے نوازا۔

''چلئے یہ سب تو ہوتا رہے گا۔لیکن آپ کیا انتظام کر رہے ہیں۔'' کیٹرنگ

اسسٹنٹ پرنظر پڑتے ہی انہوں نے کہا۔''گیسٹ کوصرف دو چیزیں متاثر کرتی ہیں۔اچھا کھانا اوراچھی جگہ سونا۔''

''سر گیسٹ ہاؤس کو ہمارے او۔ایس صاحب نے پہلے سے ہی مینٹین کر کے رکھا ہوا ہے.......روم فریشنر مار دیں گے۔اور جہاں تک کھانے کی بات ہے تو مٹن، چکن فش اور پنیر تو رہے گا ہی سر.......ویسے پچھلے سال اس کے علاوہ بھی کچھ اورانتظام الگ سے میں نے کیا تھا.......آپ جیسا کہیں ویسا ہو جائے گا سر......!''پُراعتماد لہجے میں کیٹرنگ نے کہا۔

''کیٹرنگ صاحب آپ کے اسی کار یہ شیلی سے تو سارے ادھیکاری اتنے خوش رہتے ہیں کہ کسی آفس میں آپ کا کام نہیں رکتا۔ویل ڈن۔''پرنسپل نے مسکراتے ہوئے لفظوں کے سنہرے ہاتھوں سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تو وہ بھی اندر ہی اندر خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔

''سر ناشتے میں فروٹس کے ساتھ کاجو کشمش اور بادام وادام بھی تو لانا پڑے گا۔''وائس پرنسپل نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کی۔

''ارے کیٹرنگ کے ہوتے ہوئے اتنی چھوٹی چھوٹی بات مجھ سے مت پوچھئے۔مٹن ،چکن فش کون سا ہم اپنے گھر سے لائیں گے۔کسی سپلائر کو'پیار'سے لسٹ تھما دیجئے گا۔سال بھر وہ'کماتے'ہی ہیں یہاں سے........''پرنسپل نے'پیار'اور'کماتے'پر زور دیتے ہوئے کہا۔

تین دن تک کیمپس میں ہنگامہ رہا۔ریکارڈ دیکھے گئے۔اچیومنٹ پر نظر ڈالی گئی۔کلاس آبزرو ہوا..........سب خوش تھے کہ انہوں نے اپنے بیسٹ ٹیچنگ سے آبزرور کو اِمپریس کیا ہے۔اس کے بعد بھی خوف زدہ تھے کہ پتا نہیں کس بات پر میٹنگ میں ڈانٹ پڑ جائے۔

ٹیچروں کی اِس میٹنگ سے پہلے بچّوں کے ساتھ بھی میٹنگ ہونی تھی اور وہ ہوئی بھی........اِس میٹنگ میں بچّوں کی طرف سے جب ٹیچروں کے خلاف کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تو اُنہیں لگا کہ کسی دباؤ یا خوف کے باعث تو زبان پر چُپ کا تالا لگا ہوا ہے۔اس لئے پہلے اُنہوں نے بچّوں کو کریدنے کی کوشش کی جب اس کے بعد بھی شکایت کے سمندر سے گوہرِ نایاب ہاتھ

نہیں لگے تو آخر میں حوصلہ افزائی کے لئے بے باکی کا درس اے۔ڈی کی طرف سے دیا گیا۔
''نہیں بیٹے ! ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔کون پڑھاتا ہے۔کون سیاست کرتا ہے۔کون اپنے فائدے کے لئے تمہارا استعمال کرتا ہے۔کون جان بوجھ کر اسکول کا ماحول خراب کرتا ہے۔اُس کا نام ہمیں بتاؤ........تمہارا جوحق ہے اگر وہ نہیں ملتا تو اُس کے خلاف بھی آواز اُٹھاؤ۔ضرورت پڑے تو مجھے فون کرنا۔''

ایک نے پرنسپل کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمّت جُٹائی تو سینئر پرنسپل نے رازدارانہ انداز میں اُسے سمجھایا۔

''بیٹے ! پرنسپل کے پاس بہُت ساری ذمّہ داریاں ہوتی ہیں۔کہیں اوورلک ہو سکتا ہے۔تمہارے پرنسپل تو ہم سبھوں کے لئے ایک آدرش ہیں۔تین سال قبل ان کو راشٹریہ پُرسکار مل چکا ہے۔وہ تم لوگوں کے بارے میں جو بھی سوچتے ہیں صحیح سوچتے ہیں۔تمہیں دوسری طرف دیکھنا ہے کہ اُدھر کیا گڑبڑی ہے۔تاکہ ہم لوگ اس پر ایکشن لے سکیں۔سمجھے۔''

اور بچّے بھی عمر کی اس سیما پر کھڑے تھے جہاں اُنہیں سمجھنا ہی تھا،اس لئے آگے اُنہوں نے بھی سمجھداری سے کام لیا اور فون پر بات کرتے رہنے کا وعدہ کرلیا۔

انسپیکشن کا کام پورا ہو چکا تھا۔

پرنسپل خوش تھے۔لیکن جانے سے پہلے چاہتے تھے کہ ڈی۔ڈی صاحب اُنہیں ایسا منتر دے جائیں کہ دس ایکڑ میں ایک چھتر راج قائم رہے۔

''سر سب سے لاسٹ میں آپ ٹیچروں سے میٹنگ تو کریں گے نا.......؟''

''ہاں کیوں........؟''

''سر! وہ میٹنگ میں ایک مرتبہ آپ........''

''وہ مجھے معلوم ہے۔''

''دوچار کا نام لکھ کر دو اور بتا دینا کہ 'نیتا' کون ہے۔''

''جی........جی سر''

شام کی چھوٹی سوئی دائرہ نُما گھڑی کے دائیں طرف سے نیچے اُترتے ہوئے چار نمبر کے بیچوں بیچ آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ انسپیکشن ٹیم کو پانچ بجے اسٹیشن کے لئے نکلنا تھا۔ اسٹیشن پہنچنے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ لگتا تھا۔ ٹرین آٹھ بجے کے آس پاس تھی۔ لیکن اب تک میٹنگ کال نہیں کی گئی تھی۔ ٹیچر بھی چاہ رہے تھے کہ ڈی۔ڈی صاحب بغیر میٹنگ کئے چلے جائیں تو ڈانٹ سے بچ جائیں گے........ گاڑی کیمپس سے باہر نکلے گی اور تین دن کی تھکان نکالنے گھروں کی طرف چل پڑیں گے........ اس دوران کچھ اسٹاف پرنسپل چیمبر کے پاس کھڑے تھے۔ کچھ مین گیٹ کے نزدیک اور کچھ جھنڈ بنا کر گاڑی کے ارد گرد الوداع کہنے کے لئے بے تاب تھے۔

یکا یک پردہ سرکا اور پرنسپل صاحب چیمبر سے باہر نکلے........

''ایسا ہے مترو! ڈی۔ڈی صاحب میٹنگ لیں گے۔ آپ سبھی لائبریری میں بیٹھ جائیں۔''

پرنسپل چیمبر کے آس پاس جو اسٹاف تھے ان سے لائبریری نزدیک تھی۔ وہ من پسند پچھلی صف کی کرسیوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے۔ جو گیٹ کے پاس تھے اُنھوں نے بیچ کی صف کو اپنے لئے محفوظ سمجھا۔ لیکن جو کار کے ارد گرد منڈلا رہے تھے اُنہیں پہنچنے میں وقت لگا۔ اس لئے مجبوراً اگلی نشست میں بیٹھنے کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں لائبریری کے باہر ہلچل سی ہوئی اور اندر گہرا سکوت پھیل گیا۔

بلیک کوٹ پینٹ میں ڈی۔ڈی صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ داخل ہوئے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے بغل میں اے۔ڈی صاحب۔ اس کے بعد سینیئر یٹی سے تینوں پرنسپل براجمان ہوئے۔ پرنسپل صاحب نے بعد میں ڈی۔ڈی صاحب کے بغل میں کرسی لگوا لی۔

پھر اسٹاف پر ایک نظر ڈالی۔ کھڑے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

’’آدرنیہ ایسٹ ریجن کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر خالد حبیب صاحب، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، جتیندر ترپاٹھی جی، ہمارے سینئر پرنسپل سوہن داس جی، روبن ریڈی جی اور شیخ الاسلام صاحب........!‘‘

’’یہ ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ ڈی۔ڈی صاحب تین دن تک ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ان کا آشروچن پہلے بھی ہمارے ساتھ تھا اور آج بھی ہے۔ان کا مارگ درشن ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہا ہے۔جب بھی میں نے اسکول کے پرابلم پر ان سے فون پر بات کی ہمیشہ انہوں نے ہماری رہنُمائی فرمائی۔اس اسکول پر ان کی خاص کرپا ہمیشہ سے رہی ہے.........سر! ہمارے جو کلیگ ہیں وہ بہت محنتی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ہم پچھلے سال نائینٹی ایٹ پرسینٹ ہی ریزلٹ دے پائے۔ایک فیل ہوا۔خیر جو ہو گیا وہ ہو گیا۔میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس سال کا ریزلٹ ہنڈریڈ پرسینٹ ہوگا اور ساتھ میں ہم کوالیٹی بھی دینے کی کوشش کریں گے۔‘‘

اس کے بعد تینوں پرنسپل کی طرف سے سینئر پرنسپل نے انسپیکشن سے متعلّق اپنے خیالات کا اِظہار کیا۔

’’تین دن تک ہم سب نے اسکول کی ایکٹی ویٹی کو نزدیک سے دیکھا ہے۔لیکن ہم میں سے کوئی بھی آپ کے کام سے خوش نہیں ہے.........بچوں کا ٹوائلیٹ اتنا گندا ہے کہ وہاں سے گذرتے ہوئے ناک بند کرنا پڑا۔ہر طرف کوڑا کرکٹ اور بدانتظامی نظر آئی۔وارڈین اور ہاؤس ماسٹر اپنی ذمہ داری نبھانے میں فیل ہیں۔ہر جگہ کام رام بھروسے چل رہا ہے۔اسکاؤٹ اینڈ گائڈ کے بچّوں کو تو نیم تک نہیں معلوم۔این سی سی کیڈیٹس کو تو مارچ پاسٹ تک نہیں آتا۔سی سی اے میں تو ایسا لگتا ہے کہ بس ۱۵؍اگست، ۲۶؍جنوری اور ۲؍اکتوبر کو چھوڑ کر کچھ ہوتا ہی نہیں۔اکزامینیشن، بائیو، کیمسٹری، فزکس اور میتھ ڈیپارٹمینٹ کو آپ لوگوں نے بیمار کر رکھا ہے۔ پریکٹکل بس نام کا ہوتا ہے۔کاپی میں اکّا دُکّا سائن نظر آیا۔لائبریری میں کتابیں اس طرح سجی ہوئی ہیں جیسے شوکیش ہو۔کتابیں بکھری ہوئی نظر آنی

چاہئے ۔ ہر سیلف سے دو چار کتابیں نکلی ہوئی معلوم ہوں ۔ ٹیچروں کے ریکارڈ سے پتہ چلا کہ صرف دو چار ٹیچر ہی ایسے ہیں جنہوں نے پورے سال میں دو تین کتابیں لی ہیں ۔ جب آپ پڑھیں گے نہیں تو پڑھائیں گے کیا؟.........آپ سرکار سے ہنڈسم سیلری لیتے ہیں ۔سارے انچارج کان کھول کر سن لیں کہ ایسا کرنے سے کام نہیں چلے گا ۔ میرے انڈر میں آپ لوگ کام کر رہے ہوتے تو میں سب کا اے ۔سی ۔آر رنگ چکا ہوتا..........'' تھوڑا رک کر پھر انہوں نے آگے کہا۔''میوزک ڈیپارٹمینٹ اور کیٹرنگ کا کام سراہنئے ہے ۔ دیٹس آل ۔''

پھر اے ۔ڈی صاحب کھڑے ہوئے ۔

''کلاس انسپیکشن کی بنیاد پر اگر دیکھیں تو اس اسکول کی حالت پورے ایسٹ ریجن میں سب سے نیچے ہے ۔ نہ کسی نے صحیح سے لیسن پلان بنایا تھا اور نہ ہی سبجیکٹ سے ریلیٹیڈ کچھ ڈسپلے ہی کیا تھا ۔اور اگر کسی نے کیا بھی تھا تو اس کا ٹاپک سے بہُت زیادہ کوئی ریلیشن نہیں تھا ۔ بورڈ ورک زیادہ تر کا پوور تھا ۔ بچّے پڑھ نہیں پار ہے تھے ۔ پھر جس مینتھڈ سے لوگ پڑھا رہے تھے وہ تو بہُت اولڈ ہے ۔ یہ کمپیوٹر ئیگ ہے ۔ پروفیشنل گروتھ کے لئے سب کے پاس لیپ ٹاپ ہونا چاہئے ....'' کچھ رُک کر اُنہوں نے آگے کہا ۔''نہ آپ صحیح سے کاپی چیک کرتے ہیں ۔ اور نہ ہی صحیح سے ہوم ورک ہی دیتے ہیں ۔ ہر کلاس کی دو چار کاپیوں میں ہی کچھ سائین وائین نظر آیا ۔ باقی سب میں ٹِک سے کام چلایا گیا ہے ۔ کہیں کسی غلطی پر کوئی نشان یا کرکشن ورک بھی نہیں ملا ۔ یہ دھوکا ہے پروفیشن کے ساتھ ۔اور ہم ایسے لوگوں کو نہیں بخشتے ....'' کہتے کہتے وہ ایک بار رُکے اور پھر بولے ۔''اکاڈمک انچارج، بی الرٹ ۔کبھی بھی سسپینشن اور ٹرمینیشن کی گھنٹی بج سکتی ہے ۔ اور جس کا اسکول کے کام میں دل نہیں لگتا وہ ریزائن کرے اور گھر جائے ۔ سمجھے سب!''

ویسے سمجھ تو سب گئے تھے ۔لیکن ہمّت کر کے سینیئر میتھ ٹیچر کا اُٹھنا اور سمجھی ہوئی باتوں کو سمجھانے کی کوشش کرنا ایک الگ بات تھی ۔

''نہیں سر! ہم لوگ پراپر کاپی چیک کرتے ہیں ۔ضرورت پڑنے پر کریکشن بھی

کرتے ہیں۔آپ جس کلاس کا بھی کہیں گے اس کی پوری کی پوری کاپی لاکر دکھا سکتے ہیں سر۔''

''اچھّا تم ہولیڈر اس اسکول کے۔کیا نام ہے تمہارا.......؟''

''ستیہ جیت''

''کتنے سال سے یہاں ہو؟اور گھر کہاں ہے؟''

''سر پانچ سال سے اور.........''

''اسی ڈسٹرکٹ میں گھر ہے تمہارا۔اس لئے بولی نکل رہی ہے۔'' پھر وہ پرنسپل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔''آپ اس کا پورا بائیوڈاٹا اور ہر سال کے دسویں اور بارہویں کا ریزلٹ مجھے بھیجئے۔میں دیکھتا ہوں کہ اسکول کا ریزلٹ خراب ہونے میں کہیں اس کی 'لیڈری' کا تو رول نہیں ہے۔اور آپ ایسے ٹیچرز جو آپ کی بات نہیں سنتے ہیں اس کے بارے میں ہمیں لکھ کر دیجئے........؟ جہاں نارتھ ایسٹ، کارگل اور لاہول اسپیتی کا ٹکٹ کٹا تو سارے ہوش ٹھکانے لگ جائیں گے۔''

ستیہ جیت کو اے۔ڈی صاحب سے ایسی امید نہیں تھی۔وہ اندر سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔بیٹھنے کی ہمّت تک نہیں تھی۔ابھی وہ بیٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ آواز گونجی۔

''سِٹ ڈاؤن''

اور ستیہ جیت تھر تھراتے ہوئے اپنی سیٹ پر دھنس گئے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ٹیچر جو اپنی دفاع میں کچھ کہنے کے لئے زبان تول رہے تھے،ان کی بھی گھگھی بندھ گئی۔

اب آخر میں باری تھی ڈی۔ڈی صاحب کی.........

وہ اپنی رعب دار آواز اور غُصّے کے لئے صرف اس ریجن میں ہی نہیں ویسٹ، نارتھ اور ساؤتھ میں بھی مشہور تھے۔میٹنگ میں ذرا بھی اِن ڈسپلین انہیں پسند نہیں تھا۔جب وہ اے۔ڈی تھے تب سے ان کا سکہ ملک بھر میں چل نکلا تھا۔

''ہاں تو ٹیچر بندھوؤں.......!''

''آپ نے اے۔ڈی اور سینئر پرنسپل سے اپنے کارناموں کے بارے میں سُن لیا ہے۔میں یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتا کہ اسکول کا ریزلٹ خراب ہو۔ ویسے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس اسکول میں پالٹکس بہُت ہوتا ہے اور کوئی بھی ٹیچر ڈھنگ سے پڑھاتا نہیں ہے۔انسپیکشن رپورٹ سامنے ہے۔میں چاہوں تو اس گراؤنڈ پر دو چار کو ابھی سسپنڈ کر سکتا ہوں.........سب کے سب بی اے، ایم اے، بی ایڈ ایم ایڈ ہو،اس میں سے ایک دو نے تو پی۔ایچ۔ڈی بھی کر رکھی ہے۔لیکن ایسی پی۔ایچ۔ڈی کا کیا فائدہ؟ جو بچّوں کے پرفارمینس کو نہ بڑھائے.......''ایک پل سانس لینے کے لئے رُکے اور پھر دہاڑنے لگے۔ ''گھسے پٹے طریقوں سے خود کو باہر نکالو۔ پڑھانے کے نئے نئے طریقے اپناؤ۔نئی ٹکنالوجی کے ساتھ خود کو جوڑو۔نہیں تو ریزائن کرو۔ بہت سارے ٹیلینٹیڈ ٹیچر سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔اگر یہ نہیں کر سکتے تو ڈسپلین میں رہ کر پرنسپل کے کام میں ہاتھ بٹاؤ۔بات سمجھ میں آ گئی نا سب کو........؟''

ٹیچر سر جھکائے عجیب کشمکش میں تھے کہ وہ کیا کریں........؟ محنت کے خون جلا کر دن رات پڑھاتے ہیں۔ان کا چوبیسوں گھنٹے خیال رکھتے ہیں۔کاپی چیک کرتے ہیں۔ پرابلم کو حل کرتے ہیں۔اچھّا ریزلٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔اسکول کے کام میں کبھی کبھی بیوی بال بچّوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود انہیں ہر سال کچھ ایسی ہی پھٹکار سننا پڑتی ہے۔آخر کیوں......؟ لیکن اس 'کیوں' کا کسی کے پاس کوئی جواب تھا بھی تو ان میں میں وہ جوش اور وہ ولولہ نہیں تھا کہ وہ کھڑے ہونے کی ہمّت دکھا سکتے۔

چاروں طرف عجیب سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔لیکن اس خاموشی میں بھی پرنسپل کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جسے کچھ لوگ سمجھ رہے تھے۔کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔اس دوران ڈی۔ڈی صاحب نے بھی ترچھی نظروں سے پرنسپل کی طرف دیکھا تھا اور پوچھا تھا۔

''پرنسپل صاحب اور کوئی بات ہو تو بتائیں........؟''

''نہیں سر بس! آپ کا آشرواد اسی طرح بنا رہے۔'' پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے۔''
ویسے سر میں اپنے ٹیچروں کی طرف سے آشواسن دیتا ہوں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس سر
میری آپ سے ایک ہی گذارش ہے کہ مجھے سسپینڈ کر دیں۔ لیکن آپ کے قلم سے میرے
کسی ٹیچر کو نقصان نہ پہنچے۔''

سر ہلاتے ہوئے ڈی۔ڈی صاحب نے کہا۔''چلو تم کہتے ہو تو چھوڑ دیتا ہوں۔''
پھر ٹیچروں سے مخاطب ہوئے۔''لیکن اب سے کسی طرح کی کوئی شکایت نہیں ملنی چاہئے۔
اگلے سال انسپیکشن میں پھر آؤں گا۔ اس کے لئے ابھی سے کمر کس کر تیّار ہو جاؤ۔ کوئی بہانہ
نہیں چلے گا۔ سیدھے کلاس روم میں سسپینشن لیٹر تھماؤں گا۔ سمجھ گئے نا سب........'' جب
لگا کہ سب سمجھ گئے ہیں تب اُنہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔''اور ہاں! کسی کو اس
سلسلے میں کچھ کہنا ہے تو وہ بے جھجھک اپنی بات رکھ سکتا ہے؟''

دس سالہ تاریخ میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ اس طرح کی تلخیوں کے بعد کسی
نے کچھ کہنے کی ہمّت کی ہو۔ اس لئے جملہ پورا ہوتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تبھی
سنّاٹے کو چیرتی ہوئی پچھلی صف سے ایک آواز اُبھری۔ یہ آواز ایک ہفتہ قبل جوائن کرنے
والے ہندی شکچھک وکاس کمار رائے کی تھی۔ جو پرانے اور سینئر ٹیچروں کی حالت زار کو دیکھنے
کے بعد آئندہ انسپیکشن کے لئے خود کو ابھی سے تیار کر لینا چاہتے تھے۔

''سر! کیا اچھا ہوتا کہ جانے سے پہلے آپ میں سے کوئی ایک' ماڈل ٹیچنگ' کر
کے مجھے بتا دیتے تا کہ........''

وکاس جی ہاتھ جوڑے مورت کی طرح کھڑے تھے۔

ڈی۔ڈی صاحب اپنی فطرت کے خلاف بغیر کچھ بولے جھاگ کی طرح کرسی پر بیٹھ
گئے۔ پھر ملتجی نگاہوں سے اے۔ڈی کی طرف دیکھا۔ اے ڈی صاحب نے پرنسپل کی طرف۔
اور دیکھنے کا یہ سلسلہ آخری کرسی تک چلتا رہا ....

☆☆☆

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

حرامی

میرا باپ کون ہے؟

یہ سوال ہوش سنبھالتے ہی گورا کا پیچھا کرنے لگا تھا۔اُس کا چہرہ نہ ماں سے ملتا تھا اور نہ ہی باپ سے۔دونوں کے چہرے سیاہ تھے اور نقش ونگارا لگ۔مزدور کہیں کے بھی ہوں، چہرے ایک سے دکھائی دیتے ہیں۔لیکن خون پسینہ نچوڑنے والے ٹھکیداروں کا تعلق کسی قبیل سے ہو وہ اپنے ہاؤ بھاؤ کے باعث دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں......اب لوگ گورا کو بھی دور سے پہچاننے لگے تھے کہ یہ 'خون' ٹھیکیدار ہے جس نے کام دینے کے بہانے اس کی ماں کو ورغلایا ہوگا اور مزدوری کے ساتھ نو ماہ کا بونس گود میں ڈال دیا ہوگا۔

تقریباً پانچ سو گھروں کا یہ جھونپڑ پٹّی والا علاقہ شہر کے بیچوں بیچ تھا۔ بڑے ہسپتال کے ٹھیک پیچھے۔قریب دس ایکڑ زمین میں آباد۔ بڑی بڑی نالیوں سے گھرا ہوا۔ گذرتے ہوئے ایسا لگتا جیسے شہر کی ساری گندی یہیں آ کر جمع ہوتی ہے۔اندر بھی جگہ جگہ کچی نالیاں سڑتی رہتیں۔سوّر اور مرغیاں اِنہی گندگیوں سے خوراک حاصل کرتے اور ہر طرف گندگی پھیلاتے نظر آتے..........درمیان میں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔میدان کے بیچ میں ایک مندر۔مندر کے چاروں طرف ایک ایک نل لگے ہوئے تھے۔صبح وشام پانچ سے سات بجے تک ان نلوں میں مزدوروں کا ہجوم لگا رہتا۔دو میں مرد نہاتے اور دو میں عورتیں۔ یہیں ہفتے بھر کی کھٹّی میٹھی باتیں سامنے آتیں۔اتوار کے دن تو میلہ لگ جاتا۔دن بھر پانی رہتا۔کچھ لوگ صبح سویرے نہا دھو کر مارکیٹ یا فلم گھروں کی طرف نکل پڑتے۔ کچھ لوگ

آرام سے اُٹھتے ۔ ایک ساتھ بہت سارے لوگ جب نلکے پر جمع ہوجاتے تو ''تُو تُو ہَمیں مَیں'' اور دھکا مکّی بھی ہوتی ۔ جوان لڑکے بہانے سے عورتوں کے نلکے کی طرف جھانک تاک کرتے ۔لڑکیاں بھی رنگ برنگی لباس میں منڈراتی رہتیں ۔بچّے کی چھٹّی سے لے کرشادی بیاہ اور پوجا پاٹھ سب یہیں ہوتے ۔ بڑے بڑے ساؤنڈ باکس لگائے جاتے ۔ علاقائی ڈانس دن رات جاری رہتا ۔کیا عورت کیا مرد ۔سب ہاتھ میں ہاتھ دیئے نظر آتے ۔ پینے پلانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ۔پھوہڑ گانوں اور بے ہنگم آواز کو لے کر اکثر آس پاس والے تنگ رہتے ۔ مار پیٹ تک کی نوبت آ جاتی ۔ پھر شام ڈھلے یہاں نشے کا کاروبار سج جاتا ۔ پولس اکثر ریڈ کرتی ۔لیکن جھونپڑ پٹی کی بھول بھلیّوں میں پولس مات کھا جاتی ۔شہر کا مافیا ہمیشہ جیت جاتا ۔کیوں کہ پولس والوں میں بھی کچھ نشیڑی تھے اور اس کی دلالی کرتے تھے ۔

محلّے کے انٹرنس کے ٹھیک سامنے پیپل کا پیڑ تھا اور اس کے چاروں طرف بڑا سا سمنٹیڈ چبوترہ ۔سارے اہم فیصلے یہیں طے پاتے ۔ گورا کی پیدائش کے فوراً بعد دائی اُس کے پیکڑ باپ کو دکھانے اِسی چبوترے پر آئی تھی تاکہ فوراً بخشش مل سکے ۔ دیکھتے ہی تمام لوگوں نے حیرت سے اس کے باپ کی طرف دیکھا تھا اور طنز سے کہا تھا ۔''بیٹا' گورا' ہوا ہے، مٹھائی کھلاؤ ۔'' مٹھائی پہنچنے سے پہلے ہی' گورا' کی کہانی گھر گھر پھیل گئی اور وہ اس کے وجود کا حصّہ بن کر نام کے ساتھ چپک گیا ...... اِس طرح اُجلا، اُجلی، سفیدا، سفیدی، گوری جیسے کچھ اور بھی نام اِسی چبوترے نے پیدا کئے ۔بغل میں ہی چائے پکوڑے کی دکان تھی ۔ٹھیکیدار یہیں سے مزدوروں کو لے جایا کرتے تھے ۔آس پاس کے عاشق مزاج لونڈے بھی موٹر سائکلوں میں بیٹھ کر چائے پکوڑے کا لطف اُٹھاتے دیکھے جاتے ۔صبح و شام یہاں بھیڑ سی لگی رہتی تھی ۔

گورا اِسی چبوترے پر ہر دم بیٹھا رہتا ۔

آتے جاتے لوگوں کی نظر اکثر اُس پر پڑتی ۔کوئی اِس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ مزدوروں کی اس نسل سے گورا کا کوئی تعلق ہوسکتا ہے ۔لیکن وہ تھا تو ان میں سے

ہی ۔ ماں کبھی حقیقی اور غیر حقیقی نہیں ہوسکتی ۔لیکن باپ کے بارے میں سوال داغا جا سکتا تھا۔ ایسے کتنے چبھتے سوال تھے جس کا درد گورا نے ہوش سنبھالنے سے لے کر جوانی کی دہلیز تک سہا تھا۔

ایک دن مزدوروں کے بچّوں کے ساتھ وہ چبوترے میں بیٹھا لوڈو کھیل رہا تھا۔ سامنے ایک گاڑی رکی ۔جس میں سے تین چار لوگ چائے کی دکان پر آئے ۔ایک نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔اُس کے کان کھڑے ہو گئے ۔

''دیکھ اِس لونڈے کو کون کہے گا کہ یہ مزدور کی اولاد ہے۔سالا ہم میں سے ہی کسی ٹھیکیدار کا کارنامہ ہوگا۔''

پھر ایک نے آواز دے کر اپنی طرف بلایا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''گورا۔''

''اپنا اصلی نام بتاؤ؟''

اس نے جب راشن کارڈ والا نام باپ کے ٹائٹل کے ساتھ بتایا،تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''لیکن شکل سے لگتے نہیں ہو کہ تم ان مزدوروں کی اولاد ہو۔'' دوسرے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں ہے تو تمہیں کیا؟'' تیسرا لطف لینے کے موڈ میں تھا۔

''جانے بھی دو کسی نہ کسی کی اولاد تو ہے۔''چوتھے نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔پھر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سب گاڑی کی طرف بڑھ گئے ۔

اِدھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور اُدھر اس نے لوڈو پر زور سے لات ماری اور گھر آ کر سیدھے باپ کی گردن پر دونوں ہاتھ رکھ دیا۔

''سچ سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟ نہیں تو گلا دبا دوں گا۔''

نشے کی حالت میں دھُت کھاٹ پر پڑے پڑے اس نے گورا کی طرف دیکھا اور زور سے ایک چپت لگائی۔

''سالے تو مجھے نہیں پہچانتا۔ تیری ماں کا بھتار اور تیرا باپ ہوں بے۔''

وہ کھاٹ پر ایک بار پھر ادھ مرا سا پڑ گیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

گورا روتے روتے بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ جب شام کو ماں کام سے لوٹی تو اس نے ٹفن اور چھاتا چھینتے ہوئے غصّے میں پوچھا۔

''ماں سچ سچ بتاؤ میرا باپ کون ہے؟''

کیوں یہ اُلٹے سیدھے سوال پوچھ رہا ہے تو......؟'' پہلے ماں گھبرا گئی۔ پھر ڈانٹنے لگی۔ ''تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ یہ جو گھر کے کونے میں کھاٹ پر لیٹا پی کر دن رات سویا رہتا ہے یہ کون ہے؟''

''ماں میں نے بچپن سے اِسے ہی باپ جانا ہے۔ لیکن ماں میرا چہرہ ذرا بھی نہیں ملتا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔'' گورا رونے لگتا ہے۔

''دیکھ تیرا چہرہ تو مجھ سے بھی نہیں ملتا۔ اس کا مطلب میں تیری ماں بھی نہیں ہوں۔''

''لیکن لوگوں کا منہ کیسے بند کروں؟ ماں پر کسی نے سوال نہیں اُٹھایا اور باپ سے میرا رنگ نہیں ملتا۔''

''دیکھ یہ تو رنگ رنگ کیا لگا رکھا ہے۔ اِس جھونپڑ پٹی میں تیری طرح کتنے ہی بچّوں کا رنگ گورا ہے۔ صرف ایک تو ہی تو نہیں ہے نا......؟''

''ماں تم ٹنکو، پنکو، چنّو منّو، اُجلا، اُجلی اور گوری جیسے بچّوں کی بات کر رہی ہے نا ....؟ ان سب کے بارے میں بھی لوگ گندی گندی باتیں کرتے ہیں کہ سب 'حرامی' کی اولاد ہیں۔''

''اگر وہ حرامی مل جائے تو کچّا چبا جاؤں گی۔ بہکاتا ہے میرے بچّے کو۔ دور کرنا

چاہتا ہے مجھ سے.........'' کہتے کہتے ماں رونے لگتی۔ سینے سے چمٹا لیتی اور سمجھاتی۔'' بیٹا دنیا والوں کا کیا ہے جس کے منہ میں جو آئے کہتے رہتے ہیں۔ اُلٹی سیدھی باتوں میں اپنا موڈ مت خراب کرو۔ تمہیں میری قسم ہے۔''

لیکن آگے چل کر ماں کی اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے حرکات و سکنات میں اور بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ وہ اب جب بھی چبوترے سے لوٹتا۔ تیور بدلے بدلے سے ہوتے۔ ماں سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتا۔ بس ایک ہی سوال کرتا کہ'' میرا باپ کون ہے؟'' اب تو ماں کے ہاتھوں کا نکالا ہوا کھانا بھی نہیں کھاتا۔ وہ ان حرکتوں سے تنگ آ چکی تھی۔ پریشان پریشان سے رہنے لگی تھی۔ مولوی، پنڈت، اوجھا اور نہ جانے کس کس کے پاس گئی۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی جان تک دینے کی دھمکی دے ڈالی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے رویّے میں کوئی سدھار نہیں آیا۔

گورا کے ذہن و دماغ میں یہ بات بس گئی تھی کہ سب کچھ ہوسکتا ہے، لیکن پی کر سوئے ہوئے اس شخص کی اولاد وہ نہیں ہوسکتا۔ دونوں کی قد و قامت میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ پیر کے انگوٹھے کے بعد والی انگلی جہاں باپ کی بڑی اور بے ڈھب شیپ لئے ہوئے تھی، وہیں اس کی انگلیاں ترتیب وار چھوٹی ہوتی چلی گئی تھیں اور دونوں کو جوڑنے سے آدھا دائرہ بناتی تھیں۔ باپ کے دونوں گھٹنوں کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ تھا اور راؤنڈ جیسا دکھائی دیتا تھا وہیں اس کی ٹانگیں بالکل سیدھی تھیں۔ باپ کا سینا سپاٹ تھا وہیں اس کا انگریزی V جیسی شان و شوکت رکھتا تھا۔ باپ کا کندھا جہاں نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا اور چلنے سے کبڑا لگتا تھا، وہیں اس کا کندھا اوپر کی طرف اُٹھا ہوا تھا اور چال میں وہ تیور تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ باپ کی گردن چھوٹی تھی اور اس کے کندھے اور سر کے درمیان کی دوری دُگنی تھی۔ باپ کے اوپر کے دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے تو اس کے دودھ میں نہائے قرینے سے ایک دوسرے میں پیوست۔ باپ کی مونچھ میں جہاں چند تنکے پھنسے ہوئے تھے اور داڑھی ٹھڈّی کے پاس ڈیرا جمائے ہوئے تھی، وہیں اُس کی مونچھیں گھنی

اور داڑھی پورے کلّے میں جلوہ بکھیر رہی تھی۔ باپ کی ناک پکوڑے کی طرح پھولی ہوئی اور اس کی لمبی اور چپٹی تھی۔ باپ کی آنکھیں جہاں زردی مائل تھیں وہیں اس کی جاذبیت سے بھر پور سفید رنگت لئے ہوئے تھیں۔ باپ کے کانوں میں جھالر کی طرح لٹکتے ہوئے بال تھے تو اس کے کان جھالروں سے بے نیاز۔ باپ کے مقابلے اس کی پیشانی چوڑی تھی۔ بال لالی پن لئے گھنگھریالے تھے تو اس کے سیاہ اور ریشم جیسے چمکیلے اور سلجھے ہوئے۔ ہاتھ پیر کے ناخُن جہاں چپٹے تھے وہیں اس کے لمبے۔ یعنی سر سے لے کر پیر تک وہ اپنا اور جب اپنے باپ کے جسمانی ساخت کا موازنہ کرتا تو حیرت انگیز تبدیلی دیکھ کر کانپ جاتا۔ یہ سلسلہ ہر روز کسی نہ کسی سطح پر اس کے اندر جاری رہتا اور ہر بار اس عمل سے گذرتے ہوئے اُسے لگتا کہ اگر اس کے جسم کا ایک بھی حصّہ اس کے باپ سے میل کھاتا تو اُسے تھوڑی سی تقویت ملتی اور وہ کسی طرح اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتا کہ ایسی عورت جو میرے جیسے بچّے کو جنم دیتی ہے اُسے جینے کا کوئی حق نہیں۔ پھر کبھی یہ سوچتا کہ جو عیاشی کی خاطر عورتوں کے جسم سے کھیلتا ہے اور بچّے کو اپنا نام دینا گناہ سمجھتا ہے اس کے خاص عضو کو تراش کر چوراہے پر لٹکا دیا جانا چاہئے۔ کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ ''حرامی'' کہلوانے سے بہتر ہے خود کو موت کے حوالے کر دینا۔

لیکن پھر سوال سامنے کھڑا ہو جاتا کہ وہ خود کو کیوں ختم کرے؟ اس نے کیا کیا ہے؟ یہ تو لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ اُسے ''حرامی'' کہتے ہیں؟ اس نے کوئی حرام کاری نہیں کی ہے۔ جیسے سب اس دنیا میں آئے ہیں ویسے وہ بھی آیا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ دو جسموں نے غلط طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے حرام کاری کی اور عجیب بات ہے کہ ''حرامی'' وہ ہو گیا جو سرے سے منظر نامے میں ہی نہیں؟

وہ اپنے باپ کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ راہل تیواری ایڈووکیٹ کی طرح اپنی ماں کو اس کا حق دلانا چاہتا تھا، بلکہ اس جگہ لے جا کر اس کے پیٹ میں چاقو گھونپنا چاہتا تھا جہاں اس نے عیاشی کا نطفہ ماں کی کوکھ میں ڈالا تھا۔ ماں کو بھی ایسی

ہی سزا دینا چاہتا تھا کہ خود کو بیچ کر اس کے وجود کا سودا کیوں کیا.........؟ گندے خون کی پرورش کرنے سے کہیں بہتر تھا کنویں میں کود جانا۔کیا ضروری تھا اُسے دنیا میں لانا؟ پیدا ہو بھی گیا تھا تو ماردینا تھا۔زندگی دے کر جو بھول کی ہے اس کی سزا ملے گی۔ورنہ خود کو مار کر سمجھوں گا کہ میں نے اپنے 'حرامی' ماں باپ کو ماردیا ہے۔

گورا کا اب ایک ہی کام تھا۔دن بھر شہر کی خاک چھاننا۔جہاں کہیں کام چل رہا ہوتا اس کے گیٹ کے پاس بنے جھگّی نما ہوٹلوں میں بیٹھ کر وہ تمام ٹھیکیداروں پر نظر رکھتا۔اُن کے چہروں کو بغور پڑھتا اوراپنی عمر میں جا کر ماضی کے کیمرے سے اس کی تصویر کھینچتا اور حال کی تصویر سے ملاتا کہ شاید مشابہت کا کوئی زاویہ سامنے آجائے۔لیکن لاکھ کوشش کے باوجود کچھ ہاتھ نہ آتا۔

اب وہ ماں کی ہر ایکٹی ویٹی پر نظر رکھنے لگا تھا۔وہ کہاں جاتی ہے؟ کس کے یہاں کام کرتی ہے؟ کس سے ملتی ہے؟ کب گھر سے نکلتی ہے؟ کب لوٹتی ہے؟ فون پر کس کس سے بات کرتی ہے؟ اوور ٹائم کب کب کرتی ہے؟ ماں کیوں رکتی ہے؟ اکیلے رکتی ہے یا پھر دوسری ریجا بھی ساتھ ہوتی ہے؟ لنچ کے ٹائم اس کے ساتھ کون کون ہوتا ہے؟ وہ کس کے ساتھ چائے پینا پسند کرتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ چائے کے پیسے کوئی اور دیتا ہے؟ کہیں وہ اُس ٹھیکیدار کا آدمی تو نہیں جس کی وہ ناجائز اولاد ہے؟

''میں ناجائز نہیں ہوں۔حرامی نہیں ہوں۔'' اب تو وہ نیند میں بھی چلاّنے لگا تھا۔ ان حرکتوں سے ماں کی اُلجھن اور بڑھ گئی تھی کہ بیٹے کا یہی پاگل پن ایک دن اُس کی زندگی پر بھاری پڑ جائے گا۔وہ سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔لیکن وہ سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ایک دن ماں اُجلی کو بہلا پھسلا کر اپنے گھر لائی تا کہ پاگل پن پر پیار بھاری پڑ جائے اور بیاہ کا پھندہ اس کے گلے میں پڑ جائے۔لیکن پہلے ہی دن گورا نے ایسا جھانپڑ مارا کہ اُجلی بے ہوش گئی۔کافی ہنگامہ ہوا۔لیکن ماں نے معاملہ سنبھال لیا۔

ماں جانتی تھی کہ اس کی ایک غلطی نے بیٹے کو بددل کیا ہے۔وہ بات تک نہیں کرتا

۔ باپ کی طرف تو اُسے دیکھنا بھی پسند نہیں ۔ پی کر نیچے گر جائے تو بھی کوئی مطلب نہیں ۔ وہ تو اُسے ماں کے یار کے طور پر دیکھتا تھا۔ کئی بار اس نے باپ کو گھر سے نکالنے کے بارے میں سوچا۔ لیکن بچپنا یاد آ جاتا۔ کاندھے پر سوار ہو کر گھوڑا گھوڑا کھیلنا۔ ضد کر کے کھلونے منگوانا ۔ مٹھائیاں کھانا، ایک بستر پر سونا، کہانیاں سننا........ کئی ایسے یادگار لمحات تھے جس کی وجہ سے وہ چاہ کر بھی باپ کو گھر سے باہر نہیں نکال سکا۔ لیکن اب مصلحتاً باپ کی کوٹھری سے نکل کر ماں کی کوٹھری میں اپنا بستر بچھا لیا تا کہ ماں اندھیرے میں نکلے تو عاشق کے ساتھ اسے بھی چاقو سے گود دے ۔ اس کے لئے برسوں رات جگّا کیا ۔ دوسری طرف منہ کر کے گہری نیند سونے کا ناٹک رچا ۔ ماں کی ہر کروٹ پر چونکتا ہوا۔ لیکن کبھی ماں کو پکڑ نہیں پایا۔

ماں ہر وقت ڈری سہمی سی رہتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ گورا کی رگوں میں کس کا خون دوڑ رہا ہے۔ شہر میں صرف ایک ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے اس کے باپ نے ایک ہی رات میں کئی کانٹے نکالے تھے ۔ یوں تو وہ دوسرے شہر کا رہنے والا تھا اور وہاں بڑے پیمانے پر اس کا کام چلتا تھا۔ گورا کی پیدائش کے چار پانچ سال بعد اپنے شہر لوٹ گیا تھا۔ یہاں صرف ایک ٹھیکہ چل رہا تھا جسے اس کے حوالی موالی دیکھ رہے تھے ۔ ایک دن جب چپکے سے اس نے فون پر بیٹے کے پاگل پن کا ذکر کیا تو عاشق ٹھکیدار چلاّیا۔

''اس سے پہلے کہ وہ مجھے مارے میں ہی اُسے ختم کروادوں گا۔''

دو پاٹوں کے درمیاں پھنسی ہوئی ماں نے رو رو کر جان بخشنے کی دہائی دی کہ '' آخر ہے تو وہ آپ ہی بیٹا۔ کسی کی بھی موت میں نہیں دیکھ سکتی۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

''خالی دماغ شیطان کا۔ دن دن بھر آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ اگر ہو سکے تو کہیں کام پر لگوا دو۔''

''منشی گری کرے گا وہ........؟''

''کئی جگہ سے آفر آیا تھا۔ لیکن خون تو ٹھیکیدار کا ہے۔ ٹھکرا دیا اس نے۔''

''اچھا ....'' کچھ رُک کر۔'' تو ٹھیک ہے میں اسے کہیں ایسی جگہ جہاں پیٹی کونٹریکٹر کا کام دلوا دیتا ہوں جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ایک بار کام پر لگ گیا اور شادی بیاہ ہوگیا تو باپ ڈھونڈنے کا سارا بھوت اُتر جائے گا۔میرا وہاں ایک خاص آدمی ہے جو سارا لین اپ کرلے گا۔''

پھر منصوبہ بند طریقے سے اس خاص آدمی نے گورا سے دوستی کی اور اُسے ایک جگہ پیٹی کونٹریکٹر کے کام پر لگوا دیا۔

ایک ٹھیکیدار کے طور پر جب پہلی بار گورا نے اپنے سائٹ پر انٹری ماری تو اس کی نظر سانولی سلونی تیکھے نین نقش والی ریجا پر اس وقت پڑی جب وہ سمنٹ سے بھری کڑاہی سر پر رکھ رہی تھی۔ایسا کرنے کے دران بندھا ہوا دوپٹہ اس کے سینے کے کساؤ سے ذرا پرے سرک گیا تھا اور اُبھار تھا کہ جمپر کی سلائی کو پھاڑ کر باہر نکل جانے کے لئے بے چین تھا۔ بے چین تو گورا بھی ہو گیا تھا۔اس لئے دیر تک وہ کام دیکھنے کے بہانے وہیں کھڑا رہا۔پھر کرسی منگوا کر آرام کرنے کے بہانے بیٹھ گیا اور مسلسل اُسے دیکھتا رہا۔اس بات کا احساس ریجا کو جیسے ہی ہوا کہ نئے ٹھیکیدار بابو کی نظر اس کی جوانی پر بار بار پڑ رہی ہے۔تو وہ مڑ کر کڑاہی اُٹھانے لگی۔لیکن وہ زیادہ دیر تک خود کو دوسری طرف موڑ کر نہیں رکھ سکی۔کیوں کہ گورا تھا ہی اتنا جاذب نظر۔پھر چوری سے وہ بھی اس کی طرف دیکھنے لگی کہ اگر پہلی نظر میں ٹھیکیدار بابو نے اُسے چُن لیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔کام بس نام کا رہ جائے گا ۔اور کام بھی کیا؟ آفس کی صفائی اور وہی چائے پانی۔

گورا مسلسل اُسے دیکھے جا رہا تھا اور دیکھنے کے اس عمل میں وہ بہت کچھ سوچتا جا رہا تھا کہ اِس عمر میں اُس کی ماں بھی ایسی ہی لگتی ہوگی اور وہ ٹھیکیدار..........وہ ٹھیکیدار میری جگہ اِسی طرح بیٹھا ہوگا اور اُس نے چپکے سے اسی طرح ماں کو دیکھا ہوگا۔اور پھر اس نے بہانے سے اُسے آفس میں بلایا ہوگا۔

''تو کیا یہ لڑکی بھی اُس کے بلانے پر آفس آ جائے گی؟'' جواب بھی اس نے خود

ہی دیا۔" کیوں نہیں یہ بھی ماں کی طرح ایک 'ریجا' ہی تو ہے۔"

"سُنو! یہاں کہیں پاس میں چائے وائے کی دکان ہے؟"

"ہاں ہے نا صاحب! یہیں پاس میں۔ آپ بولیں تو جا کر آپ کے لئے چائے لا دوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے پہلے ہاتھ منہ اچھے سے دھولو۔"

اور جب وہ کیتلی لے کر جانے لگی تو اُس نے سوچا کہ اسی طرح ایک دن اس کی ماں بھی کیتلی لے کر گئی ہوگی اور جب لوٹی ہوگی تو اُس نے کرسی خالی دیکھی ہوگی اور جب وہ آس پاس کے ریجا قُلی سے پوچھی ہوگی تو اُسے بتایا گیا ہوگا کہ ٹھیکیدار بابو آفس کی طرف گئے ہیں۔ اور پھر وہ آفس کی طرف بڑھ گئی ہوگی۔ وہاں ٹھیکیدار بابو پیر پھیلائے، پیسوں سے بھرا پرس سامنے رکھے ماں کا انتظار کر رہا ہوگا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اُس کی طرح ہی اُس نے کہا ہوگا۔

"ہاں اندر آ جاؤ۔"

سانولی سلونی اس ریجا کی طرح اس کی ماں بھی اندر آ گئی ہوگی اور گلاس میں چائے ڈالنے لگی ہوگی تو ٹھکیدار بابو نے کہا ہوگا۔"بس بس تھوڑی سی چائے اپنے لئے رکھ لو۔" اور پھر چائے لینے کے بہانے اس نے ہاتھ پکڑ لیا ہوگا اور بیڈ پر بٹھا لیا ہوگا اور پیار سے اس کی طرح ہی پوچھا ہوگا۔

"نام کیا ہے تیرا؟"

"جھمری۔"

"ایک دن کی مزدوری تمہیں کتنی ملتی ہے؟"

"ٹھیکیدار بابو دینے والے تو آپ ہی ہیں۔ ایک سو پچاس روپئے۔"

"اس سے گھر چل جاتا ہے؟"

جھمری کی طرح ماں نے بھی کہا ہوگا۔"نہیں۔"

اور پھر ٹھیکیدار بابو نے پیار سے ماں کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہا ہوگا۔ ''کتنا کھر درا ہے تمہارا ہاتھ۔کل سے سمنٹ بالو چھوڑ کر آفس کی صفائی پر لگ جاؤ۔تنخواہ دگنی کر دوں گا۔بس دن میں ایک بار چائے پانی پلا دیا کرنا۔''

جھمری کی طرح ماں نے بھی مسکراتے ہوئے پہلے ''نا'' کہا ہوگا۔نخرے دکھائی ہو گی۔ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی ہوگی۔پھر ٹھیکیدار بابو نے ماں کو کس کر پہلو میں بھر لیا ہوگا۔ اور پھر.........پھر جھمری کی طرح ماں کا بھی روز کا معمول ہو گیا ہوگا۔آفس کی صفائی کرنا اور چائے پلانا۔اور پھر جب ایک دن جھمری کی طرح ماں نے بتایا ہوگا کہ ''وہ اس کے بچّے کی ماں بننے والی ہے'' تو ٹھیکیدار بابو نے کہا ہوگا۔

''کسی نرسنگ ہوم میں جا کر ابارشن کروا لو۔''

''نہیں ٹھیکیدار بابو! یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے۔میں بچّہ نہیں گرواؤں گی۔''

جھمری کی طرح ماں نے بھی کہا ہوگا۔

'' آج نہیں تو کل دنیا بچّے کے باپ کا نام پوچھے گی۔تب تم کیا کروگی؟ مجھے بدنامی منظور نہیں۔کسی قلی کا نام بتاؤ جس کے ساتھ میں تمہاری شادی کر دوں۔خرچ ورچ سارا میں سنبھال لوں گا۔اور ہاں کل سے تمہیں کام پر آنے کی ضرورت نہیں۔ہر ماہ تنخواہ کے ساتھ بچّے کا خرچ بھی پہنچ جائے گا۔لیکن اگر غلطی سے بھی تم نے کسی کے سامنے منہ کھولا تو وہ تمہارا آخری دن ہوگا۔سمجھ گئی۔''

اور جس طرح جھمری نے سب کچھ سمجھتے ہوئے نہایت ہی سمجھداری سے ''منگرو'' کا نام بتایا تھا اسی طرح سے ماں نے بھی اس کے اس پیکڑ باپ کا نام بتایا ہوگا جو آج کل ماں کے پیسے سے شراب پی کر گھر میں پڑا رہتا ہے۔لیکن وہ ماں کا اتنا وفادار ہے کہ لاکھ جھگڑا ہونے کے باوجود اس ٹھیکیدار کا نام زبان پر نہیں لاتا۔شاید زندگی پیاری ہو۔اس لئے نشے میں بھی وہ ہوش میں رہتا ہے۔

جھمری کو جس طرح نرسنگ ہوم بھیجا گیا تھا، اُسی طرح ماں کو ٹھیکیدار نے چپکے

سے بھرتی کیا ہوگا۔ پھر اس کی طرح چھُپ کر دیکھنے آیا ہوگا۔ اُس وقت اس کے پیکّڑ باپ نے بھی منگرو کی طرح ماں کے کان میں چپکے سے کہا ہوگا۔''ٹھیکیدار بابو آئے ہیں۔'' جھمری کی طرح ماں بھی شرمائی ہوگی۔ پھر جھمری کے اشارے پر جس طرح سے منگرو اس کی طرف اسٹول بڑھا کر دروازے سے باہر نکلا تھا، اُسی طرح اس کا پیکڑ باپ بھی باہر نکلا ہوگا، اور تب ماں نے اپنا آنچل ہٹا کر جھمری کی طرح بچّے کو دکھایا ہوگا۔ مسکراتے ہوئے کہا ہوگا۔

''تمہارا بیٹا ہوا ہے۔ بالکل تمہاری طرح ہے۔''

پھر جب اس کی طرح ٹھیکیدار بابو نے جھک کر بچّے کو غور دیکھا ہوگا تو یقیناً اُسے بھی اُس نوزائدہ بچّے کے اندر اپنا باپ نظر آیا ہوگا............اب پتہ نہیں اس نے اس کی طرح اپنے باپ کو کیوں نہیں ڈھونڈا؟ لیکن جب گھر لوٹتے ہی گورا ناراض ماں سے بے تحاشہ لپٹ گیا اور یہ کہا۔

''آخر میں نے باپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔ بہت پیارا ہے ماں۔ تم اُسے جا کر گھر لے آؤ۔''

تب ماں کا منہ حیرت سے کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

☆☆☆

ریئلیٹی شو

''یہ وہ زمانہ نہیں کہ بچّوں کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا جائے۔ یہ سب ریئلیٹی شو کی پیداوار ہیں۔ میں تو اِسے ڈانسر بناؤں گی۔''

ڈاکٹر کپل تھکے ہارے ڈسپنسری سے جب گھر لوٹے تو آتے ہی اُنہوں نے اپنی پانچ سالہ بیٹی کے گلے میں اسٹیتھو اسکوپ پہنایا۔ ائرپیسیس کو کانوں میں ڈال کر ڈایافرام ہاتھوں میں دیا۔ اور گود میں اُٹھا کر ابھی دن بھر کا پیار اُس پر نچھاور کرنا ہی چاہا تھا کہ تبھی شوبھا دوڑی ہوئی آئی اور اُن کی گود سے پریتی کو اُتار کر پہلے اسٹیتھو اسکوپ چھینا۔ پھر ایک طرف پھینکتے ہوئے چلائی۔ اُس وقت ڈاکٹر کپل نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''سب کچھ گیت سنگیت اور ڈانس سے نہیں ہوتا۔ تم نے بھی ہائر ایجوکیشن حاصل کی ہے۔ اس لئے تمہیں ایجوکیشن کی ویلیو معلوم ہونی چاہئے۔''

'' ویلیو...!'' وہ مسکراتی ہے۔ ''وہ اپنے بازو والے انجینیئر ہیں نا؟ ان کی سات سالہ بیٹی نے ڈانس کمپٹیشن میں ایک کروڑ جیتا ہے۔ چار مہینے تک مسیز شرما بیٹی کے ساتھ کبھی دہلی اور ممبئی کے اسٹار ہوٹلوں میں رہی ہیں۔ ٹی وی پر ماں کی بھی تصویریں آ رہی تھیں۔ میں تو کل تک خود کو اس سے سُپر سمجھتی تھی۔ لیکن اب اس گنوار سے بھی مجھے ٹپس لینے پڑیں گی۔''

''دیکھو میں ڈسپنسری سے تھکا ہارا لوٹا ہوں۔ چائے وائے پلاؤ۔ یہ سب باتیں چھوڑو۔ پہلے پریتی کو پڑھنے دو۔ پھر دیکھیں گے کہ اُسے کیا بننا ہے۔ یہ ڈانس وانس اور گیت سنگیت میں رکھا ہی کیا ہے۔ کل تک یہی بھانڈ منڈلی میں ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع

پر گھر گھر ناچتے گاتے تھے۔''

''کون ناچتا گاتا تھا مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ٹھیک سے سن لو۔ بعد میں یہ مت کہنا کہ میں نے نہیں بتایا.... کالونی کی عورتوں کے ساتھ آج میں بھی ڈانس کلب گئی تھی۔ بڑی مشکل سے پریتی کا ایڈمیشن بیس ہزار میں کروایا ہے۔ سنڈے سنڈے ایک ٹیچر کو بھی گھر پر بلا لیا ہے۔ وہ مہینے میں صرف پانچ ہزار لے گا۔''

''پانچ ہزار....؟'' منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہوگئی۔ صبح دس بجے سے دو بجے تک اور پھر پانچ بجے سے آٹھ بجے تک۔ یہاں تک کہ لنچ کے ٹائم نرسنگ ہوم میں بیٹھتا ہوں تا کہ زیادہ کما سکوں۔ تمہارے کہنے پر ہی باپ دادا کی نشانی کو اونے پونے میں بیچ کر میں ہائی سوسائٹی میں رہنے آیا تا کہ پریتی کو ایجوکیشن کے لئے بہتر ماحول مل سکے۔''

''ایجوکیشن...!؟'' وہ تیکھی ہنسی ہنستی ہے۔'' جسے تم بھانڈ منڈلی سمجھتے ہونا؟ اس کا رتبہ بڑے بڑے ایجوکیشنسٹ سے اوپر ہے۔ وہی نئی نسل کے آئیڈیل ہیں...... آج کون ہے جو شاہ رُخ اور ایشوریہ کو نہیں جانتا؟ گیت سنگیت اور ڈانس کی خوبصورت سڑک ہی فلم انڈسٹری تک جاتی ہے۔ خوبصورتی تو آج ایک اے ٹی ایم کارڈ ہے۔''

''تم ماں ہو کر بیٹی کو کیش کرانا چاہتی ہو۔'' ڈاکٹر کپل نے ''کیش'' پر زور دیتے ہوئے ماں کی عزّت کو للکارا تو ماڈرن دور کے فیمنزم کلچر کو جسے آدھی دنیا قبول کر چکی ہے اُسے شوبھا نے نئے سیناریو کے پیشِ نظر کچھ اِس طرح سامنے رکھا جیسے اُس کی غلطی نہ ہو۔ سب پتی کی ہی غلطی ہو۔

''ٹی وی میں جتنے اشتہار آتے ہیں اس میں پروڈکٹ چاہے سوئی ہو یا جہاز سب میں خوبصورت لڑکیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اچھّی آواز کیا صرف گوری لڑکیوں کے پاس ہوتی ہے۔ تم نے کبھی کسی چینل میں کالی یا بدصورت لڑکی کو خبریں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میگزین کا کور ہو تو لڑکی۔ بینک کا کاونٹر ہو تو لڑکی۔ سیلز مین ہو تو لڑکی۔ پی اے ہو تو لڑکی۔ ہر فرم میں کمپیوٹر پر نازک انگلیاں تھر کاتی نظر آئیں گی لڑکیاں۔ دنیا کی اس ریئلیٹی سے کون انکار کر

سکتا ہے کہ جس کی بیٹی جتنی خوبصورت ہوگی اُن کے یہاں رشتے دروازوں سے ہی نہیں کھڑکیوں اور روشن دانوں سے بھی آتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ بازار میں جس چیز کی ڈیمانڈ ہو اُسے گوڈون میں رکھ کر سڑانا کون سی عقل مندی ہے....؟''

☆

ڈاکٹر کپل نے جب آس پاس کا جائزہ لیا تو اُنہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بچّے چاہے کسی سوسائٹی کے ہوں اُن کے اندر 'ریئلیٹی شو بخار' کا ایسا وائرس داخل ہو گیا ہے جو پڑھ لکھ کر آئی اے ایس، ڈاکٹر، انجینیئر، پرفیسر اور وکیل بننے کو بے وقوفی سمجھتا ہے۔ الکٹرانک میڈیا نے انٹرٹینمینٹ کے نام پر معصوم بچوں کے سامنے گیت سنگیت ڈانس اور ہنسی مذاق کی تھالی میں ڈبل مینگ جیسی سیکسی پکوان پروس کر ان کے ذہن کو ایسا اسٹیر یوٹائپ بنا دیا ہے کہ رات دن ان کی زبان پر وہی ذائقہ چڑھا رہتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر سبھی بچّے ڈانسر، گیت کار، لافٹر یا پھر جوکر ہو گئے تو پھر ملک کی ترقّی کا کیا ہوگا؟ کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے؟

لیکن شوبھا کو فکر صرف اپنی تھی۔ اس لئے آنکھوں میں ریئلیٹی شو کا ایسا رنگین چشمہ لگا رکھا تھا کہ روشنی سے شرابور اسٹیج پر چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہونٹوں سے نکلتے مدھر گیت اور گیتوں پر تھرکتے پاؤں اور وی آئی پی باکس میں سج دھج کر بیٹھی عورت اور اس کے چہرے پر جیت کی بھینی بھینی خوشبوؤں میں لپٹی مسکراہٹ اور اس مسکراہٹ میں زندگی کا سارا حسن جو میڈیا کی چکا چوندھ نے عطا کیا تھا۔ اس کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہی اب اس کی زندگی بن چکا تھا۔ وہ پریتی کو بھی ڈانس کے گُر سکھا کر منچ پر اُتارنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ بھی وی آئی پی باکس کا حصّہ بن سکے۔ وہ بھی کیمرے کے مرکز میں سمٹ سکے۔ اس کے چہرے پر بھی جلتے بجھتے قمقمے آنکھ مچولی کا کھیل کھیلیں اور اس کے چہرے پر بھی چاندنی جیسی مسکراہٹ ہو۔ پریتی کے ہر پرفارمینس پر اس سے بھی انٹرویو لئے جائیں۔ پریتی ٹیلینٹ کا پرچم لہرائے اور لاکھوں کروڑوں کا چیک اس کی گود میں آ کر گرے۔

ڈاکٹر کپل کی اب اپنے ہی گھر میں ایک نہیں چل رہی تھی۔ شوبھا اپنے سنہرے

منصوبے پر عمل پیرا تھی۔ اب وہ اسکول اور چھوٹے چھوٹے کلبوں میں پریتی کے ڈانس کی نمائش لگانے لگی تھی۔ شہر کے اخباروں میں تصویریں شائع ہو رہی تھیں۔ ہر جگہ پریتی ماں کی گود میں نظر آتی۔ ایک دن مشہور اخبار ''نمبر ون'' کے ایک رپورٹر نے معصوم بچّی سے اس کی عمر سے بڑا سوال کر دیا۔

''بیٹا چھ سات سال کی عمر میں آپ اتنا بہترین پرفارمینس کیسے کر پاتی ہیں.....؟''

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس کی طرف سے میں جواب دیتی ہوں۔'' پریتی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شوبھا نے مائک اپنی طرف گھما لیا۔ ''کیا ہے کہ یہ جب تین سال کی تھی تب سے ہی اس کے پاؤں میوزک کی تھاپ پر تھرکنے لگے تھے۔ میں تو اسے پڑھانا چاہتی تھی۔ لیکن بھگوان نے بچپن سے ہی ڈانسر کے سارے گُن بھر دئے تھے۔ ڈانس سے بے انتہا پیار کی وجہ سے میں نے اسکول چھڑوا کر اسے ڈانس کلب جوائن کرا دیا۔ اب تو اس کے انگ انگ میں ڈانس رچ بس گیا ہے۔ ڈانس ہی اس کا عشق ہے۔ ڈانس ہی اس کا پیار۔ اور ڈانس ہی اس کا بھگوان بھی۔ کیا بیٹی میں سچ کہہ رہی ہوں نا....؟'' آنکھ مٹکاتے ہوئے اس نے پریتی کی طرف دیکھا۔

''جی۔ جی مما۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ ویسے تو اس کے دل میں آیا کہ وہ کہہ دے کہ پیسے کے لالچ میں میری ماں دن رات مجھ سے ڈانس کرواتی ہیں۔ نہیں کروں تو مارتی پیٹتی ہیں۔ کھانا بند کر دیتی ہیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں پریکٹس نہیں کی تو ایلیمنیٹ ہو جاؤں گی اور لاکھوں روپئے ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے....میں بھی آزادانہ زندگی جینا چاہتی ہوں۔ لیکن زبان کھولتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ مجھے جان سے مار نہ ڈالے۔

''ایک آخری سوال: جب بچّوں کی عمر کھلونے خریدنے کی ہوتی ہے تب ماں باپ قانون کی آنکھوں میں آرٹ کلچر اور انٹرٹینمنٹ کی پٹّی باندھ کر ریئلیٹی شو کے لئے شفٹوں میں کام کرواتے ہیں۔ اس میں کتنی سچائی ہے؟''

اس سوال پر شوبھا پہلے مسکراتی ہے۔ ''ہاں اس میں سچائی ہے۔ میں ایسی کئی ماؤں کو

جانتی ہوں.....'' اصل سوال کو ہضم کرتے ہوئے بات کا رُخ دوسری طرف کچھ اس صفائی سے موڑ دیتی ہے کہ رپورٹر بھی شوبھا کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔''میں نے پریتی کے فیوچر کی خاطر پتی کو چھوڑا ہے۔ وہ اسے بھی اپنی طرح ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔کیا رکھا ہے آج کل کے ڈاکٹر میں.......؟ میں نے بہت سمجھایا۔لیکن وہ نہیں مانے۔اب جب بیٹی کو میں نے لائن اپ کر دیا ہے اور کچھ ہی دنوں میں کروڑوں میں کھیلنے جا رہی ہے تو وہ سمجھوتہ کے لئے تیار ہیں۔''

☆

ڈاکٹر کپل گھر کے دو چار لوگوں کے ساتھ مل بیٹھ کر بات کرنے کے حق میں تھے۔لیکن شوبھا تیار نہیں ہوئی کہ آج کل فیصلے گھر کی چہار دیواری میں نہیں بلکہ لائٹس، کیمرے اور اوڈیئنس کو سامنے ٹی وی چینل کے دفتروں میں ہوتے ہیں۔ جسے پوری دنیا دیکھتی ہے۔اس لئے اس نے اس پاپولر چینل کا انتخاب کیا جس میں ایک نچنیا نیم عریاں لباس زیب کئے فحاشی کی زبان میں چٹخارے لے لے کر اُلٹے سیدھے فیصلے سناتی ہے۔

''ہاں تو جناب اب یاد آپ کو بیٹی آ رہی ہے جب وہ کمانے لگی ہے۔ بیٹی کو ڈانسر تو آپ کی پتنی نے بنایا ہے۔اس لئے اس کے پیسے پر پورا ادھیکار.......'' ''کیوں بھائیو اور بہنو! ان کی پتنی کا ہونا چاہئے یا نہیں؟'' اوڈیئنس کی طرف سے ''ہاں ہاں'' کا شور اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تالیوں کی گڑگڑاہٹ۔ ڈاکٹر کپل کے کان پھٹنے لگتے ہیں۔اس دوران وہ کھڑی ہو کر دو چار ٹھمکے لگاتی ہے اور پھوہڑ ہنسی ہنستی ہے۔''اگر یہ سب منظور ہے ڈاکٹر! تو پھر میں آپ کی شوبھا شری کو سمجھاؤں گی کہ وہ آپ کو اپنے گھر بلا لے۔لیکن اتنا یاد رکھنا کہ جب تک وہ خود سے یہ نا کہے کہ میں بیمار ہوں تب تک انجکشن لگانے کی غلطی نہیں کرنا۔سمجھے.......؟''

ڈاکٹر کپل کسی بھی قیمت پر جہاں شوبھا رہ رہی تھی وہاں جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن عمر کی بارہویں سیڑھی میں قدم رکھتے ہی بیٹی کی فکر ستانے لگی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شوبھا ریئلیٹی شو کے آسمان سے برستے پیسے کی بوندوں سے پریتی کو قبل از وقت اتنا شرابور کر دے گی کہ اس کے چھوٹے اور جسم سے چپکے کپڑے خود بخود ٹرانسپرنٹ ہو جائیں گے۔وہ

بھاگنے کی کوشش بھی کرے تو بھی کسی چھت تک پہنچتے پہنچتے بھیگ ہی جائے گی۔اس لئے وہ 'چھتری' بن کر اس گھر میں رہنا چاہتے تھے۔

لیکن کچھ ہی دنوں میں شوبھا کو بیٹی کے اوپر تنی باپ کی چھتری پسند نہیں آئی۔ جھنجھلاہٹ اور غصّے میں ایک دن اس نے ڈاکٹر کپل کی طرف طنز بھرے شبدوں کی برچھی پھینکی....."اے سی کار میں بیٹھنے والوں کو بارش سے بچنے کے لئے کسی چھتری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں اُسے بچارن نہیں ڈانسر بنا رہی ہوں۔ جو قیمت چکانی پڑے گی میں چکاؤں گی۔کرپیا آپ یہاں سے جائیں۔"

انڈر سکسٹین سُپر ڈانسر ریئلیٹی شو کے فائنل پانچ کنٹسٹینٹ میں پریتی کی جگہ بنانے میں شوبھا نے کئی بار قیمت چکائی۔اور ہر قیمت کے بدلے ہر ہفتے ایک ایک زینہ وہ اوپر اُٹھتی رہی۔ یہاں تک کہ پریکٹس کے بعد کئی بار پریتی نے ماں کے کان میں کچھ کہا.....لیکن شوبھا اُسے ہر بار سمجھاتی رہی۔"بیٹی جس اونچائی پر تمہیں پہنچنا ہے۔اس میں سے سمجھو یہ ایک سیڑھی ہے۔لیکن ذرا سوچو کہ اگر کسی نے اس وجہ سے سیڑھی کھینچ لی تو سارے خواب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ بیٹا سکھانے والوں کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔اس لئے جتنا ان کا حق ہے وہ لیتے ہیں تو لینے دو۔چھونے چھانے سے کیا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد پھر پریتی نے ماں کے کان میں کبھی کچھ نہیں کہا۔کہا تو باپ کے کان میں بھی کچھ نہیں۔لیکن آتے جاتے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر انہیں ایک طرح کا ڈر ستانے لگتا تھا۔ جب بھی بارش کا امکان ہوتا وہ چھتری لے کر سڑک پر آجاتے کہ کہیں پریتی نظر آجائے تو وہ اس کے سر پر چھتری تان سکے۔لیکن کبھی ایسا نہ ہوسکا۔اور ہر بار وہ مایوس قدموں کے ساتھ گھر لوٹتے رہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ چھتری پرانی ہوتی گئی۔ اس میں جگہ جگہ سوراخ بننے لگے۔اب بارش میں اس چھتری کا استعمال بے معنی ہو گیا تھا۔اس لئے چھتری کو اسٹور روم کی قبر گاہ میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا۔

اب ڈاکٹر کپل کی زندگی کے تالاب میں تلخی کی کائی پرت در پرت اور بھی جمنے لگی۔ جمتے جمتے جب پانی کی اوپری سطح پر ہرے بھرے میدان آباد ہو گئے تو ان کی زندگی اُس الگی کے پودے کی طرح ہو گئی جو ہوا کے زور اور برساتی پانی کے بہاؤ میں اپنے وجود کو بچانے کی جدو جہد کرتے ہیں۔ ایسے میں اُنہوں نے اپنے اندر کی کائی کو خود سے الگ کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جتنا وہ کوشش کرتے کائی اور بھی جمتی چلی جاتی۔

ڈاکٹر کپل نے نوکرانی کے بیٹے شیام سندر کو پریتی کی کتابیں دے کر اور اس کی پڑھائی کا خرچ اُٹھا کر شوبھا کے خلاف زندگی کی جنگ میں شامل کر لیا تھا۔ شوبھا اُسی شیام سندر کو ہر روز کچھ ایسے کپڑے دھونے کے لئے دیتی تھی۔ جس سے اُسے گھن سی آتی تھی۔ وہ ہر روز اسے چھوڑ دیا کرتا تھا۔ پیر دبانے اور مالش کی بات کو وہ ٹالنے کی کوشش کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اُسے ہر روز شوبھا کی مار کھانی پڑتی تھی۔ ماں اُسے بچانے کے لئے آگے آتی کہ لاؤ میں دھو دیتی ہوں۔ مالش کر دیتی ہوں۔ لیکن شوبھا اُسے دھکّے دے کر شیام سندر سے زبردستی دُھلواتی۔ پیر دبواتی۔ مالش کرواتی کہ نوکر ہو کر اگر ابھی سے یہ سب کی عادت نہیں رہی تو پھر جوان ہو کر کیا کرے گا؟

☆

شوبھا نے جب یہ دیکھا کہ اتنی قیمت چکانے کے بعد بھی پریتی فائنل تک نہیں پہنچ پائی ہے تو اس نے اُسے ماڈلنگ اسکول جوائن کروا دیا۔ اُن دنوں شوبھا کے پسندیدہ چینلوں میں ایف ٹی وی جیسے کئی چینل شامل ہو گئے تھے۔ ماڈلنگ کی مقناطیسی کشش اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کیٹ واک کرتی ادھ ننگی لڑکیوں کی طرح شوبھا پریتی کو بھی ویسا ہی کرنے کے لئے کہتی۔ ''بیٹا کپڑے تھوڑا اور اوپر اٹھا لو۔ بٹن ایک دو زیادہ بھی کھل جائیں تو کوئی بات نہیں۔ نمبر اسی کے تو ملتے ہیں۔ سب کچھ چھپا رہ گیا تو بے چارے ججیز کیا دیکھیں گے؟ نمبر کہاں دیں گے؟''

ماڈلنگ اسکول جاتے ہی فٹنس کے نام پر درجنوں مرد پریتی کی خوبصورتی کو اُبھارنے کے لئے تندہی سے جٹ گئے۔ اُسے صبح و شام ٹرائل سے گذرنا پڑتا۔ سینہ، ناف،

کمر اور نہ جانے کس کس چیز کی ناپ لی جاتی ۔کبھی کبھی شوبھا بھی فیتہ لے کر بیٹھ جاتی ۔ کپڑے اُتروا دیتی ۔ پریتی شرماتی تو وہ کہتی ۔''یہ سب مالش کرنے والے ہاتھوں کا کمال ہے کہ کم وقت میں تمہارا انگ انگ سیکسی سانچے میں ڈھلنے لگا ہے ۔میں تو دن رات بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتی ہوں کہ تمہارا جسم اتنا خوبصورت ہو جائے کہ دنیا کا ہر مرد تمہیں اس روپ میں دیکھنے کے لئے میان سے اپنی اپنی تلواریں کھینچ لے۔''

ٹرانس پرینٹ کپڑے کا لیمینیشن کروا کر جب شوبھا نے پہلی بار لیمی نیٹیڈ گرل پریتی کو رینپ پر کیٹ واک کے لئے اُتارا تو ہزاروں آنکھوں نے آپس میں تلواریں کھینچ لی تھیں ۔اُس کی چال، کمر کا لوچ ۔ناف کے بھنور اور سینے کے اُبھاروں کو دیکھ کر لوگ پاگل ہو اُٹھے تھے ۔اس نے ایسی قیامت برپا کی کہ بڑے بڑے فیشن ڈیزائنر اپنے اپنے برانڈ کو پرموٹ کرنے کے لئے منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور ہو گئے ۔کچھ دنوں تک یہاں بھی خوب ہنگامہ آرائی رہی۔لیکن رینپ پر جیسے ہی فریش لیگس نے نمائش کے لئے انٹری ماری تو شوبھا کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔کیوں کہ بازارِ حسن کے نشیب وفراز سے وہ اب بخوبی واقف ہو چکی تھی۔

یہاں سے اُس نے سیدھا بیچ پارٹی کا رُخ کیا۔جہاں دنیا بھر کے سیلانی موج مستی کے لئے آتے ہیں ۔پریتی کی خوبصورتی اور ڈانس کو دیکھ کر اُسے ایک سال کے کونٹریکٹ پر رکھ لیا گیا کہ اگر پرسنل کونٹریکٹ نے سیلانیوں کی تعداد میں اضافہ کیا تو اُسے دو بارہ سائن کیا جائے گا۔لیکن سال ختم ہوتے ہی بیچ کی خوبصورتی بڑھانے کئی ٹین ایجر لڑکیاں ایسی آ گئیں جو اس سے زیادہ دھاکے اور جلوے بکھیرنے میں ماہر تھیں۔

پھر کچھ نئے جلوؤں کے ساتھ شوبھا نے اسے کلینڈر کی رنگین دنیا میں اُتارا۔یہاں کبھی سمندری لہروں کے درمیان پریتی ہیجانی کیفیت میں تصویر کھینچواتی نظر آتی تو کبھی بھیگی ریت پرسن باتھ لیتی ادھ ننگی لیٹی رہتی۔کبھی اوپر غائب تو کبھی نیچے غائب.....

جب سال کے کلینڈر بدلے تو وہ بھی وہاں سے غائب کر دی گئی۔

کلینڈر سے نکالے جانے کے بعد شوبھا کو یہ اُمید تھی کہ اوپر نیچے کے حاضر غائب

کھیل میں پریتی نے نئے فراز کے ساتھ کچھ ایسے نایاب نشیبی جوہر دکھائے ہیں جس کی بدولت اُسے کہیں نہ کہیں کام مل ہی جائے گا۔ اور ایسا ہوا بھی۔ اسے کام کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سیکسی ٹِک کی زینت بننے کے لئے اُسے کئی فوٹوگرافرس کے آفر ملے۔ یہاں بھی خوب شہرت حاصل ہوئی۔ خوب پیسے کمائے۔ لیکن فریش لیکس کے آتے ہی اس کے کام کی رفتار میں بریک لگنے لگی..... پھر اس نے کئی چھوٹے موٹے پروڈکٹ کے ایڈ کئے۔ پینٹی برا اور کنڈوم نے اُسے آسمان پر چڑھایا۔ لیکن کوئی بڑی کامیابی نہیں ملنے کی وجہ سے بڑے برانڈ کے ایڈس جھولی میں کم گرے۔ آہستہ آہستہ اشتہار کے دروازے بھی اُس کے لئے تنگ ہونے لگے۔ شوبھا اور بھی پریشان رہنے لگی۔ وہ یہ اچھّی طرح جانتی تھی کہ فریش لیکس کی آمد سے ایک نہ ایک دن پریتی کے حسن کا سنسیکس کچھ اس تیزی سے نیچے گرے گا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا.....گرتا ہی رہے گا۔ اور گرتے گرتے منڈی کے بازار میں یہ حسن، کلب کے راستے طوائف کے کوٹھے تک مجرا کے لئے پہنچ جائے گا۔

شوبھا کو ایسی بھی اُمید تھی کہ گرتے سنسیکس کے باوجود کوئی نہ کوئی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر فلم یا ٹی وی کے لئے کسی نا کسی آئٹم ڈانس یا اے سرٹیفکیٹ میں پریتی کو سائن کرلے گا۔ وعدہ بہتوں نے کئے۔ لیکن چھوٹے موٹے آئٹم سونگ میں ایکسٹرا ڈانسر سے زیادہ کی حوصلہ افزائی کے لئے کسی نے بھی پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھا۔ اس طرح سے جب پریتی کو مس بیوٹی بنانے کا سپنا شوبھا کے سامنے چور چور ہونے لگا تو اس نے آخری پناہ گاہ کے طور پر ڈانس کلب کے انتخاب میں چھٹّی حِس کا سہارا لیا۔

☆

میٹرو سٹی کے سب سے پرانے کلب ''راج بار اینڈ ڈانس'' جوائن کرتے ہی پریتی کی قسمت کا ستارہ ایک بار پھر حسن کے آسمان میں چمکنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ یہاں پہنچتے ہی شوبھا کا اُٹھنا بیٹھنا ہائی پروفائل لوگوں کے ساتھ ہونے لگا۔ بڑے بڑے منتریوں کی پارٹی میں وہ پریتی کو لے جانے لگی۔ وی آئی پی کی خوشنودی کی خاطر شوبھا اسے کبھی بلیک شیشے والے

اِمپورٹیٹ کار میں گھنٹے دو گھنٹے کے لئے سڑکوں کی پیائش کرنے بھیج دیتی تو کبھی ڈنر پارٹی میں مزے اُڑانے کے لئے کرے تک پہنچا دیتی۔اب اُس کی آنکھیں یہ خواب بھی دیکھنے لگی تھیں کہ اِس عزّت کے عِوض اُسے آئندہ انتخاب میں عزّت پور سے ایم پی کا ٹکٹ ملے گا۔

اِدھر چائلڈ ریئلیٹی شو کی مقبولیت دن رات بڑھتی جا رہی تھی ۔ بچّے کی آنکھیں ریئلیٹی شو کے پالنے میں کھُل رہی تھیں۔اُنہیں ماں کی پستانوں سے اب دودھ کے ساتھ ساتھ گیت سنگیت اور ہنسی کے کیلشیم بھی ملنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسکول بند ہونے لگے۔اوراس کی جگہ سونگ ڈانس اور لافٹر اسکول ہزاروں کی تعداد میں کھلنے لگے۔مستقبل کو اندھیرے میں گھرتا دیکھ بہت سارے پڑھے لکھے نوجوان بھی راتوں رات یوٹرن لے کر سنگر ،ڈانسر اور لافٹر ٹیچر ٹریننگ کے فارم لئے لمبی لائن کا حصّہ بن گئے۔

ایجوکیشن سے جڑے لوگوں نے جب علم کے تئیں بچوں اور گارجین کی عدم دلچسپی کو دیکھا تو اُنہیں سمجھتے دیر نہیں لگی کی یہ سب مغرب کی نقالی میں حسن پرستی کے چولہے پر بچّوں کی ہانڈی چڑھا کر اپنے لئے عیش کی گرما گرم روٹی سینکنے میں لگے ہیں۔ رہنُماؤں نے تو دانشورانِ قوم کا بھر پور ساتھ دیا۔لیکن جب کروٹ بدلتا وقت ہر چیز میں ریئلیٹی تلاش کرنے لگا تب دیکھا دیکھی ان کے بچّے بھی ریئلیٹی کے رنگ میں رنگنے لگے۔کیوں کہ وہ جب اپنے جیسے بچّوں کے ہاتھوں میں طبلہ،ڈھولک،بینجو،گیٹار دیکھتے تو بس میں کتابیں لے کر سیٹ شیئر کرنے میں اُنہیں ذلّت محسوس ہوتی۔اس وقت بچّے عجیب نظروں سے اُسے دیکھتے۔گھر آتے ہی کئی بچّے کتابیں پھینک دیتے۔پڑھائی کے نام پر اُنہیں گھن سی آتی۔گھُٹن کا احساس ہوتا۔

ایسے ہی ماحول میں کچھ ایسے بھی گارجین تھے جو ڈانٹ ڈپٹ کر، مار پیٹ کر،ڈرا دھمکا کر بچّوں کو اسکول بھیجتے رہے۔ان کی بدولت ہی اکّا دکّا اسکول کہیں کہیں چل رہے تھے ۔لیکن اس کا چلنا نہ چلنا کوئی مطلب نہیں رکھتا تھا ۔ایسے گارجین کو لوگ دیکھ کر ہنستے۔جان بوجھ کر چھیڑتے۔''آپ اپنے بچّوں کو کہاں بھیج رہے ہیں''؟''اسکول'' سنتے ہی وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے، ہنستے اور پھر نصیحت کرنے سے باز نہیں آتے۔''آپ بچوں کو

زبردستی پڑھانے پر کیوں تُلے ہیں۔؟ تھوڑا پیسہ خرچ کر کے بچّے کو سنگیت ونگیت یا ڈانس اسکول بھیجیں۔ ورنہ فیوچر کے سٹلمینٹ میں آپ کے بچّے پیچھے رہ جائیں گے۔''

☆

پیچھے تو پریتی بھی رہ گئی تھی۔

نہیں نہیں وہ تو بہت آگے گئی تھی۔ خود سے بھی آگے.......خود سے آگے جانا اور خود سے پیچھے رہ جانا۔ یہی وہ فرق تھا جسے اب پریتی شدّت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ اگر زندگی میں سب کچھ گیت سنگیت اور ڈانس ہے تو پھر کل آنے والی نسل کا کیا ہوگا.....؟ ایسے بہت سارے سوالات اس کے ذہن کے آسمان میں ستارے بننے لگے تھے۔ لیکن شوبھا کی سورج آنکھوں کے سامنے اس کے جھلمل کرتے تارے روپوش ہو جاتے......اب تو باپ کا چہرہ بھی آنکھوں میں گم ہونے لگا تھا۔ لیکن یادیں باقی تھیں۔ جسے وہ چھپا کر رکھتی۔ جو اکثر اس کے اندر ہلچل برپا کرتی رہتی......کورٹ سے لمبی لڑائی کے بعد ماں نے اُسے جس طرح ہتھیایا تھا وہ اُس کے معصوم ذہن میں محفوظ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ماں کے خلاف نہیں جا سکتی تھی۔ عیش وآرام پر بریک نہیں لگا سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ جینا چاہتی تھی۔ اپنی مرضی سے۔ اپنی خواہش سے ......لیکن یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ ابھی اٹھارہ کی نہیں ہوئی تھی۔

پریتی کے ٹین ایج بیوٹی کو شوبھا جتنا کیش کرانا چاہتی تھی۔ کرا چکی تھی۔ اب وہ میچوریٹی میں قدم رکھنے لگی تھی۔ نئی گلوبل بیوٹی کی نظریاتی تھیوری کے مطابق حسن کی عمر چودہ سے اٹھارہ سال ہے۔ اس عمر سے جو لڑکیاں تجاوز کر گئیں، سمجھو اس کے حسن میں اسٹیگ نیشن آ گیا۔ اس کے بعد وہ صرف بچّہ ہی جن سکتی ہے۔

اس تھیوری کے مدّ نظر حسن کے نئے گلوبل ویلیج میں ٹین ایجر کی مانگ میں جب کچھ اور تیزی آ گئی تو شوبھا سوچ میں پڑ گئی کہ کہیں راتوں رات کوئی فریش لیگر راج ملہوترہ کے دل پر راج نہ کرنے لگ جائے۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ پریتی جلد سے جلد اُسے پھانس لے اور بار اینڈ ڈانس کلب کی راج رانی بن جائے۔ بچّے پیدا کرے تب بھی ٹھیک ہے۔ نہیں

کرے تب بھی ٹھیک ہے....اس کی آخری زندگی عیش کی چھاؤں میں گذرنی چاہئے۔

شوبھا کی آنکھیں اب یہ دیکھنے لگی تھیں کہ راج ملہوترہ تمام بار بالاؤں میں پریتی کو عزیز ہی نہیں رکھتے بلکہ اس پر دل و جان سے مرتے بھی ہیں۔ بات ہی بات میں اُس نے راج کے دل کو ٹٹولنا چاہا۔ وہ تو ایک اور بازی کے لئے دل وجان سے تیّار رہی تھا۔لیکن پریتی نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔''بھلے ہی دواؤں نے جسمانی طور پر وقت سے پہلے جوان کر دیا ہو لیکن قانوناً میں ابھی بالغ نہیں ہوئی۔اس لئے آپ کو جو سوچنا ہے سوچیں۔راج ملہوترہ کو کیا کہنا ہے وہ آپ دیکھیں.....''

اس میں شوبھا کے لئے دیکھنے والی کیا بات تھی۔؟ سیدھے اس نے راج سے مل کر سگائی کی تاریخ رکھ دی۔

اٹھارویں سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔راج بار اینڈ ڈانس کلب کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ پریتی اور راج کی سگائی کے اس موقعے پر شوبھا بہت خوش نظر آ رہی تھی کہ اس نے بہت صحیح وقت پر پریتی کا سٹلمینٹ کر دیا تھا۔ دوسری طرف پریتی ماں سے بھی زیادہ خوش تھی کہ آج وہ قانونی طور پر اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے سنبھالنے لے لائق ہوگئی ہے۔راج ملہوترہ کی خوشی بھی قابل دید تھی۔وہ تو پاگل سے ہو رہے تھے کہ پریتی کی آمد نے قلیل مدّت میں بار کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ کر کے اسے لائف پارٹنر کا جو حسین تحفہ دیا ہے۔وہ صدیوں میں کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

سگائی پارٹی شام میں تھی۔لیکن پریتی کی خوشی کا عالم یہ تھا کہ وہ صبح سے کئی بار قدآدم آئینے کے سامنے اپنا اسٹائل اور میک اپ بدل چکی تھی۔آخر دوپہر ہوتے ہوتے اس نے بیوٹی پارلر جانے کا ارادہ کرلیا۔شوبھا ساتھ جانا چاہتی تھی۔لیکن پریتی نے یہ کہہ کر اُسے روک دیا۔''آپ یہاں راج ملہوترہ کے ساتھ پارٹی کا انتظام دیکھیں۔میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔''

مہمان آگئے تھے۔ ہر طرف لڑکیاں میوزک پر تھرک رہی تھیں۔ جلتے بجھتے رنگین قمقمے ایک ایسا طلسماتی ماحول پیدا کر رہے تھے کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ہر کسی کو اس

انوکھی سگائی کا انتظار تھا۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ سبھی شوبھا سے پوچھ رہے تھے کہ پریتی کہاں ہے؟ اور وہ ہر کسی کو یہی کہہ رہی تھی۔ ''بیوٹی پارلر گئی ہے۔ بس آتی ہی ہوگی۔''

اس دوران شوبھا نے کئی بار فون لگانے کی کوشش کی۔ ہر بار انگیج ملا۔ راج ملہوترہ نے بھی اپنی طرف سے کوشش کی۔ کئی اور ہاتھ ٹرائی کے لئے آگے آئے۔ لیکن کسی کو کامیابی نہیں ملی.... حادثہ یا کڈنیپ کے خیال سے شوبھا اور راج کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ دونوں اپنی پریشانی کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے آرکیسٹرا اسی طرح بج رہا تھا۔ بالاؤں کا ڈانس اسی طرح جاری تھا..... کچھ قریبی لوگوں کو ہدایت دے کر یہ دونوں ابھی پولس اسٹیشن جانے ہی والے تھے کہ شوبھا کے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اسکرین پر پریتی کا نام روشن ہو گیا۔ اس کے اندر سے باہر نکلتی روح اچانک جسم کے اندر دوبارہ حلول کر گئی۔

''پریتی کا فون ہے۔'' اس نے میوزک کے شور میں چلاّ کر اپنے قریب کھڑے راج سے کہا۔

راج نے آرکیسٹرا والے کو اشارہ کیا تو پاپ میوزیکل ہنگامہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ سبھی شوبھا کو دیکھنے لگے۔ اس وقت تک شوبھا نے موبائل کان سے لگا لیا تھا۔

''بیٹا کہاں ہو۔؟ جلدی آؤ۔ سگائی کے انتظار میں بے چارے راج کا بُرا حال ہو رہا ہے۔''

پھر مسکراتے ہوئے اس نے راج ملہوترہ کی طرف دیکھا۔ ''اب زیادہ پریشان مت ہو میرے راج! بس وہ آ ہی رہی ہے۔ لیکن کب؟ یہ تم خود سے سن لو تاکہ تمہارا دل ایک بار پھر سے جوان ہو جائے......'' شوبھا نے اسپیکر آن کر کے راج ملہوترہ کو دے دیا۔

پریتی کی آواز ہال میں گونجنے لگی۔

''اسّی سالہ بوڑھے راج ملہوترہ کی پراپرٹی پر تمہاری نظر ہے۔ تم اس کی رکھیل بن جاؤ......میں مندر میں پھیرے لی چکی۔ انڈر گارمینٹس دھونے والا شیام سندر اب ڈاکٹر بن چکا ہے ماں۔''

☆☆☆

ہنڈیا پاڑہ کی ڈُمری

ٹوسو قبائلی راجا کرم اور اندو کی بیٹی تھی۔ گوہل گھرانے سے تعلق تھا۔ رہائش حالیہ گولا بلاک، رام گڑھ۔ بلا کی حسین۔ مغلیہ دورِ حکومت میں اُس کی خوبصورتی کے چرچے دور دور تک تھے۔ بنگال کے نواب علی وردی خان کا بھتیجا ایک جھلک دیکھتے ہی دیوانہ ہوگیا۔ اس نے راجا کرم پر دباؤ بنایا کہ وہ اس رشتے کو منظور کرے۔ انکار کر نہیں سکتے تھے، ورنہ ہاتھ آئی نئی نئی حکومت کی باگ ڈور پھسل سکتی تھی۔ لیکن ٹوسو اس رشتے سے خوش نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ شادی کی تاریخ رکھی جاتی، پتا کی ناموس اور اپنی خودداری کی خاطر، اُس نے 'دامودر واٹر فال' میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ آدی باسی اُسی کی یاد میں 'ٹوسو پرب' مناتے ہیں۔

مکر سنکراتی کے دوسرے دن۔ صبح سے ہی سورن ریکھا ندی میں بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ عورتیں اس موقع پر گیت گا کر خوشیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ ''کون دِلو رے لال ساڑی....... بوڑھوا بھتار دِلو رے۔'' ایسے اور اس طرح کے گیتوں کا جادو جھارکھنڈی فضاؤں میں سر چڑھ کر بول رہا ہوتا ہے۔ ہر گلی، محلّے، چوراہے میں بڑے بڑے ساؤنڈ باکس لگے ہوتے ہیں۔ چھوٹا ناگپوری سرگم کے سُر تال پر سانسیں اُوپر نیچے ہو رہی ہوتی ہیں۔ دھڑکتے دل کے ساتھ مرد عورتیں ہاتھ میں ہاتھ دیئے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دُھن میں ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔

میلے میں بچّے رنگ برنگے کپڑے میں جھال موڑی، چنا گھگنی، بھاجا بھیجا، بومبے مٹھائی (بڑھیا کا بال) لٹھّو، بادام پاپڑی، پکوڑی اور میٹھے پکوان کھاتے اور طرح طرح کے

جھولا جھولتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں جھانڈل، کہیں رِنگ کا کھیل، کہیں تیر اور ٹارگیٹ تو کہیں بیلون کو نشانہ لگاتے بچّے ......چشمہ، بیلٹ جوتا چپّل، ٹوپی سے لے کر بولتے چلتے دوڑتے اور گاتے ہوئے من لُبھاون کھلونے موجود ہوتے۔ کہیں پان کی دکان تو کہیں چائے کی۔ بانسری والا بانس میں چھوٹی بڑی بانسری کھونسے اور بیلون والا رنگ برنگے بیلون کو الگ الگ آکار میں پھُلا کر اُن جوڑوں کے پاس گھومتے رہتے جن کے ساتھ چھوٹے بچّے ہوتے۔ مداری کا کھیل، جادوگر کے ہاتھ کی صفائی، کھمبوں کے بیچ تنی ہوئی رسّی کے اوپر ڈنڈا لئے جسمانی توازن کا مظاہرہ کرتی لڑکی۔ ہیرو ہیروئن کے پوز میں فوٹو کھینچواتے نوجوان جوڑے۔ سب کے سب اپنی ہی دُنیا میں مگن ہوتے۔ ایک طرف گوشت بِک رہا ہوتا، تو دوسری طرف 'ہنڈیا' کے ساتھ چکھنا۔ اس دن عورت ہو یا مرد، بچے ہوں یا بوڑھے، جوان لڑکے، لڑکیاں سب کی زبان پر صبح سے شام تک اسی 'ہنڈیا' کا ذائقہ چڑھا رہتا۔ جگہ جگہ فٹ بال میچ۔ انعام میں موٹر سائکل، ٹی وی اور خصّی وغیرہ رکھے جاتے۔

یہاں کا 'مرغ میلہ' ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ لوگ 'خونی لڑائی' دیکھتے ہیں اور 'جوا' بھی کھیلتے ہیں۔ کئی مہینے سے انتظار رہتا ہے۔ ہر صوبے میں ایسے ایک دو میلے لگتے ہیں۔ کہیں پندرہ دنوں میں تو کہیں مہینے میں۔ زیادہ تر جگہوں میں شروعات 'ٹوسو پرب' سے ہوتی ہے۔ اس طرح کا میلہ تین چار مہینے تک چلتا ہے۔ اتوار کو لوگ اس کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ کچھ کو حکومت سے اجازت ملی ہوتی ہے۔ صدر سکریٹری کا انتخاب بھی ہوتا ہے۔ لیکن کچھ میلے ایسے ہیں جہاں کوئی انتخاب نہیں ہوتا۔ ویسے میلے کو دلبر منڈا جیسے دبنگ لوگ چلاتے ہیں۔ جہاں اُس کا قانون چلتا ہے۔ اپنے کام میں دوسروں کی مداخلت سے تلمِلا اُٹھتے ہیں۔

'ہنڈیا پاڑہ' میں دلبر منڈا ہر ہفتے مرغا لڑائی کا اہتمام کرتا ہے۔ کسی کی ہمّت نہیں کہ اس کے خلاف زبان کھولے۔ پولس بھی کیس درج نہیں کرتی۔ مہوا سے بنائی گئی 'شراب' اور چاول کی 'ہنڈیا' کا بڑے پیمانے پر کاروبار کرتا ہے۔ گاؤں کی مزدور طبقہ عورتوں کو 'مہوہ'،

'جو'، چاول کے ساتھ ساتھ 'چکھنا' کے لئے کئی چیزیں فراہم کرواتا ہے۔ بھات (پکا ہوا چاول) کو تین دن تک سڑانے کے بعد 'باکھر گولی' ڈال کر دیسی شراب 'ہنڈیا' (رائس بیئر) تیار کی جاتی ہے۔ جسے عورتیں بیچتی ہیں۔ کون سی عورت کس چوراہے پر بیٹھے گی اس کا فیصلہ بھی دلبر منڈا کرتا ہے۔ کون پیتا ہے اور کون نہیں اس کی جانکاری بھی وہ رکھتا ہے۔ 'ہنڈیا' کو اپنے کلچر کا اٹوٹ حصّہ بتاتا ہے۔ اس لئے سب کو پینا ہے۔ نہیں پینے والوں کی کلاس لگتی ہے۔ نقصان کی بھرپائی کے لئے فائن دینا پڑتا ہے۔

☆

بُدھوا منڈوا کی بیٹی ڈُمری جو ماں کی موت کے بعد ماما کے پاس لکھنو چلی گئی تھی۔ میٹرک کے بعد انٹر کر رہی تھی کہ سڑک حادثے میں ماما کی موت ہوگئی۔ وہ باپ کے پاس لوٹ آئی۔ ساتویں تک گاؤں میں پڑھائی کی تھی۔ ابھی آئے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے لوگوں کو مُرغ لڑائی کے خلاف سمجھانا شروع کیا کہ یہ 'خونی کھیل' ہے اور اس کی آڑ میں رسم ورواج کے نام پر جو بازی لگائی جاتی ہے وہ 'جُوا' ہے۔ اس لعنت سے گاؤں والوں کو بچانا ہے۔ کالی کمائی کرنے والوں کے خلاف آواز بُلند کرنی ہے۔

اِنہی لوگوں میں سے ایک نے دلبر منڈا تک یہ بات پہنچا دی۔ اس نے ڈُمری کے باپ کو بلایا اور کہا۔ ''بیٹی کے بوندھو کورو، نا ہولے پرینام بھالو ہوبے نا۔'' (بیٹی کو روکو ورنہ انجام بُرا ہوگا)

''اَمی اوکے بوجھابو سورکار، سے تو ایکھن نادان۔'' (میں اُسے سمجھاؤں گا سرکار! وہ ابھی نادان ہے)

''نادان ہولے تو بیندھے راکھو، تو مارا نوردھے چار بچھر آگے اَمی ایر پران رکھا کورے چھِلام، ایٹائی بھیوے چھِلام۔ سے ایکھن چھوٹو، بڑو ہولے سب سیکھے جابے۔ سیئی سمیئی جُدی نینگٹا کورے گرامیر چاری پاشے گھوریئے دِتام، تا ہولے آجکے اَئی سمسیا ہوت نا۔'' (نادان ہے تو باندھ کر رکھو۔ تمہارے گڑ گڑانے پر میں نے چار سال پہلے جان بخش

دی تھی کہ ابھی چھوٹی ہے۔ بڑی ہو کر سب سیکھ جائے گی۔ اُسی وقت ننگا کر کے گاؤں میں گھُما دیا ہوتا تو آج یہ نوبت نہیں آتی)

''کچھ دِنیر مود ھئے گرا میر سمست چال چلن سِیکھے جابے سورکار۔'' (کچھ ہی دن میں گاؤں کے سارے چلن سیکھ جائے گی سرکار) اس نے دلبر منڈا کے پاؤں پکڑ لئے۔

''تو مار مون آچھے تو جو کھون تو ر بیٹی آمار پاٹھانو مُر گیر مانسو کے پھیلے دیئے چھیلو، سے دِن ایئی بھیبے چھیڑے دیئے چھِلام، جے آج نا ہولے تو کال تو بنا بیئی، آرا یکھون لونڈیا پھِر ے اے سے مُرغی لڑائی کے رکتیر کھیل بولیا۔ آمارئی وِرُدّھے اُسکا چھّے۔'' (تمہیں یاد ہے نا کہ تیری بیٹی نے میرا بھیجا ہوا مرغے کا گوشت کوڑے میں پھینک دیا تھا۔ اس دن یہ سوچ کر چھوڑ دیا تھا کہ چلو آج نہیں تو کل یہی میرے لئے مرغا بنائے گی......اور اب شہر سے لوٹی ہے تو لونڈیا مرغا لڑائی کو خونی کھیل بتا کر میرے ہی خلاف ورغلا رہی ہے)

☆

دھیان منڈا گاؤں کے مکھیا تھے۔ بُدھوا منڈا مکھیا جی کے گائے چرایا کرتا تھا۔ وہ ان کے ہی رحم و کرم پر چھوٹے سے پل رہا تھا۔ جب بڑا ہوا تو دھیان منڈا نے اپنی ایک رکھیل کے ساتھ شادی کروادی۔ وہ جب چاہتا بدھوا منڈا کو 'ہنڈیا' پلا کر اپنے گھر میں سُلا دیتا اور اندھیرے میں اُس کے گھر پہنچ جاتا۔ ڈمری کی پیدائش کے دس سال بعد تک وہ زندہ رہا۔ ان کی موت کے بعد ہنڈیا پاڑہ کی بادشاہت وراثت کے طور پر بیٹے دلبر منڈا کے ہاتھوں میں آ گئی۔ پہلے تو باپ کا ڈر بھی تھا لیکن اب کُھلے سانڈ کی طرح ہنڈیا پاڑہ میں آتی جاتی لڑکیوں کو سینگ مارا کرتا۔

ڈُمری کی بچپن میں شادی ہو چکی تھی۔ گونا نہیں ہوا تھا۔ ایک دن دلبر منڈا کھلی جیپ میں سوار ہو کر پوکھر کے راستے سے گزر رہا تھا کہ نہا کر لوٹتی ہوئی ڈُمری پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس وقت وہ بارہ تیرہ سال کی ہی تھی۔ جسمانی شاخوں پر کلیاں چٹکنے کے لئے بے تاب تھیں۔ بھینی بھینی خوشبو اور اس کی ٹین ایج بیوٹی نے اُسے پاگل کر دیا تھا.........پھر کیا

تھا: اسکول آتے جاتے پیچھا کرنے لگا۔ راستے کا کانٹا ہٹانے کے لئے اس نے اس لڑکے کو مروا دیا جس کے ساتھ بچپن میں شادی ہوئی تھی۔ نہاتے وقت مچھلی پکڑنے کے بہانے بنسی ڈال کر پوکھر کے کنارے بیٹھ جاتا۔ لیکن ڈُمری کبھی اس کے کانٹے میں نہیں پھنسی۔

ایک دن کسی نے دلبر سے کہا۔ ''اس کی ماں تیرے باپ کی رکھیل تھی'' تو وہ پاگل ہو گیا تھا اور چلاّنے لگا تھا۔ ''میرے باپ نے تو پورے گاؤں کی لڑکیوں کو رکھیل بنا رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں سب کا ڈی این اے چیک کرتا پھروں اور اس کے بعد اس سے رشتہ بناؤں۔'' دراصل وہ ڈُمری کی خوبصورتی پر مرمٹا تھا۔ اس لئے اُسے آگے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ڈمری کو حاصل کرنے کی اس نے ترکیب سوچی۔ خاص چمچہ کو بُدھوا منڈا کے پاس بھیجا۔ وہ پینے میں ماہر تھا۔ لیکن کمائی اتنی نہیں تھی۔ مفت ہاتھ آجانے پر وہ دل کھول کر پیتا تھا۔ جب انگریزی شراب سامنے رکھی گئی تو پینے سے پہلے ہی اس کے لار ٹپکنے لگے۔ خوب کھلا پلا کر چمچہ اُسے اپنے ساتھ مرغ میلے میں لے آیا۔ لڑا کو مرغ دے کر اُس سے کہا۔ '' جاؤ لگاؤ۔ جتلے مُرگا تو مار، ہار لے کونو وایا پار نیہو۔'' (جاؤ لڑاؤ اِسے۔ جیت گیا تو یہ مرغا تمہارا اور ہار گیا تو کوئی بات نہیں) اس کے بعد اس نے جس شان سے مرغ کو پکڑا اُس سے مالکانہ تیور صاف جھلک رہا تھا۔

دلبر منڈا نے ترکیب کی ٹوکری سے ایک کمزور مرغے کو نکالا اور اس کے مرغ کے ساتھ 'جوڑ' بنا دیا۔ تقریباً ایک منٹ کے اندر ہی بدھوا منڈا کے مرغے کو جیت نصیب ہو گئی۔ جیت کے دو ہزار روپے نے نشے کو اور دوبالا کر دیا۔ خاص چمچے نے پیٹھ تھپتھپائی اور ایک ہزار روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ '' آمار پک کھوتھیکے پرتھم جیتیر ......ایٹا رکھے ناؤ۔'' (یہ میری طرف سے پہلی جیت پر شگون ہے، اِسے رکھ لو)

ابھی وہ پیسے جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ دلبر منڈا سامنے آ گیا۔ اُس نے اُس کے مرغ کی قلغی چھوتے ہوئے پہلے تعریف کی۔ پھر کہا: ''بکری کر بے ایئ مُرگا ٹا۔'' (بیچو گے

اس مرغے کو؟)

بُدھوا مُنڈا جیت کے نشے میں چور تھا، بولا۔''بکری کرب نا، اِیکےلڑابوُ''(بیچوں گا نہیں، لڑاؤں گا)

اس جیت ہار میں بازی بھی لگی تو ایسی کہ اگر بدھوا منڈا جیتتا ہے تو اُسے پچیس ہزار روپئے ملیں گے اور ہارتا ہے تو بیٹی ڈُمری دلبر منڈا کی ہو جائے گی۔ جیت ہار کے درمیان جیسے ہی بیٹی ڈُمری کا نام آیا تو اُس کا نشہ اُتر گیا۔اس نے ہاتھ جوڑ لیا۔ خاص چمچے نے کان میں آ کر اُسے سمجھایا ____''ارے بوکا! اییَ بازی تے چِتو تور، پٹو تور، مانے جیتے گیلے پچیس ہزار پو کیٹے، آر ہیرے گیلے بِنا کون ٹا کاتے دِلور مُنڈا رمتو جامائی پابی۔''(ارے بدھوا! اس بازی میں تو چت بھی تیری اور پٹ بھی تیری ہے۔یعنی تو جیت گیا تو پچیس ہزار جیب میں اور ہار گیا تو مفت میں دلبر منڈا جیسا داماد مل گیا)

''کِتّو ایکھن سے تو چھوٹو آچھے مالک۔''(لیکن ابھی تو وہ چھوٹی ہے مالک)دلبر منڈا کے سامنے اُس نے ہاتھ جوڑ لیا۔

''جتو دِن نا سے بَڑ ہو چھے، سے تو مار پاسیئے تھاکبے۔''(جب تک وہ سیانی نہیں ہو جاتی تب تک وہ تمہارے ہی پاس رہے گی۔''دلبر منڈا نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

اس لڑائی میں دلبر مُنڈا کے مُرغ کی جیت ہوئی۔اس خوشی میں وہ پاہُڑ (ہارا ہوا وہ مرغا جو جیتنے والا کا ہو جاتا ہے) کا گوشت تحفے میں ڈُمری کو دینا چاہا لیکن اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ پکڑ کر جب زبردستی کی تو یہ کہتے ہوئے کوڑے میں ڈال دیا۔''تو مار مانسواَمی کھابونا۔''(مجھے نہیں کھانا ہے تمہارا گوشت)

☆

ڈُمری کی اس حرکت پر دلبر منڈا بوکھلا گیا تھا۔وہ سرِ عام ننگا کر کے گھمانا چاہتا تھا لیکن بدھوا منڈا نے رو دھو کر اور پیر پکڑ کر بچا لیا تھا۔لیکن شہر سے لوٹنے کے بعد جب اُس نے مرغ لڑائی کے خلاف لوگوں کو سمجھانا شروع کیا تو کچھ ڈُمری کی باتوں میں آ گئے اور

آئندہ سے مرغ نہیں لڑانے کا وعدہ کر لیا۔ یہ بات جب دلبر منڈا تک پہنچی تو وہ غصّے میں پھنکارنے لگا۔ بائیکاٹ کرنے والوں کو مارا پیٹا گیا۔نصیحت کی گولی کھلائی گئی۔ پھر ڈُمری کو سبق سکھانے کے ارادے سے چمچوں کے ساتھ گھر سے نکلا۔ ڈُمری کو اس کی بھنک لگ گئی تھی۔ وہ کسی طرح سے جان بچا کر تھانہ پہنچی۔لیکن تھانے والوں کا کمال دیکھئے کہ ایف آئی آر لکھنے اور کارروائی کرنے کے بجائے ، دلبر منڈا کو فون کر دیا۔ دلبر منڈا نے اس کی بہادری کا جم کر جلوس نکالا۔ پورے گاؤں میں ننگا کر کے پہلے اُسے گھُمایا اور آخر میں گاؤں سے باہر نکال دیا۔

ڈمری گاؤں کی سرحد سے دور روتی بلکتی رہی۔ سامنے ساگوان، سکھوا اور مہوا کا گھنا جنگل تھا۔ آس پاس پلاس کے درخت۔ ملگجی روشنی میں جنگل کے اس پار پہاڑوں کا ایک دھندلہ سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ شام جیسے جیسے سیاہ ہو رہی تھی اُسے جنگلی جانوروں کا ڈر ستانے لگا تھا۔ وہ کہاں جائے۔ گاؤں لوٹ نہیں سکتی تھی۔ لوٹنے کے لئے پنچا تاپ کرنا تھا۔ دلبر اور اس کی بنائی ہوئی پنچایت کے سامنے آگ کے چاروں طرف رات کے بارہ بجے سے لے کر صبح کے چار بجے تک ننگا ناچنا تھا۔ لیکن ایک اضافی شرط یہ رکھی گئی کہ وہ سب کو ایک ایک رات خوش بھی کرے۔

ڈُمری کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایسے میں مشعل لئے جنگل کی طرف سے آتا ہوا کوئی دکھائی دیا۔ اُس وقت اُس کی حالت اور بھی غیر ہوگئی تھی کہ پتا نہیں کون ہے؟ کپکپاہٹ طاری تھی۔ خود بخود اُس کا دایاں ہاتھ دونوں سینے پر جا کر ٹھہر گیا اور بایاں جانگھوں کے درمیان۔

مشعل والا شخص کچھ اور قریب آ گیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا خلافِ توقّع ڈمری کا ڈر کم ہوتا جا رہا تھا کہ اگر چور ڈکیت بھی ہوا تو دلبر منڈا سے تو خراب نہیں ہی ہوگا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ مشعل والا شخص کچھ سامنے آ کر رک گیا تھا اور اپنے جسم سے میلی کچیلی چادر اُتار کر دوسری طرف مڑ گیا تھا۔

''ایٹا شریرے لا گیئے ناؤ آرآ مار ساتھے چول۔'' (اِسے جسم پر ڈال لو اور میرے ساتھ چلو)

''کہاں؟'' وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں پوچھی کہ دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ بھوکی پیاسی تھی۔ جنگلی راستوں پر چلتے چلتے دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ شخص پہاڑ کے دامن میں بانس اور پھوس سے بنی ایک چھوٹی سی کٹیا کے پاس آ کر رک گیا اور بولا۔ ''بھیترے ایسو۔'' (اندر آؤ)

کٹیا کے اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک کونے میں پوال تھی اور اس پر میلا کچیلا گیندرا بچھا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں چلتے چلتے ڈُمری کے پاؤں سوج گئے تھے۔ اس لئے وہ چادر کو جسم پر ٹھیک کرتی ہوئی سیدھی ہو گئی۔

''ا یکھنے تو کیول ایک جنیر شوار جایگا آچھے۔'' (یہاں تو صرف ایک آدمی کے سونے کی جگہ ہے؟)

''اَمی کو تھاؤ شوئے جابو، کُڑی بچھر تھیکے جیگے تھا کار ابھیاس آچھے۔'' (میں کہیں بھی سو جاؤں گا۔ بیس سالوں سے جاگنے کی عادت جو ہے) پھر اس نے ڈمری کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''ارے تو مار تو جَور آچھے۔'' (ارے تمہیں تو بخار ہے) پھر جڑی بوٹی پیس کر اُسے پلایا اور کہا۔ ''ایکھن سوئی اے جاؤ، سوکال پر تجنتو جَور کے جابے۔'' (اب سو جاؤ، صبح تک بخار اُتر جائے گا)

دوا پیتے ہی غنودگی طاری ہو گئی۔ رات بھر ڈمری سوتی رہی اور وہ جاگتا رہا۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ صبح جب گھاس پھوس کے درمیان سے سورج اپنی کرنوں کے ساتھ کٹیا میں داخل ہوا اور ڈمری کی آنکھ پر ہالہ بن کر تیرنے لگا تو کرنوں نے دیکھا کہ مشعل والا شخص اونگھ رہا ہے اور اونگھتے اونگھتے گچھے سے ڈمری کے جسم کی مکھیّاں بھگا رہا ہے۔

ڈمری نے انگڑائی لی تو چادر کو شرارت سوجھی۔ سرکتی چادر کو جھٹ پکڑ کر سینے تک ٹھیک کرتی ہوئی وہ اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ مشعل والے شخص نے بھی ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

سنبھل کر بیٹھتے ہی ڈُمری کو عجیب کشمکش میں دیکھا تو فوراً بستر چھوڑنے کے بعد کی ضرورت کا خیال آیا۔

''بیٹی بائیرے ڈان پاشے جھرنا آچھے۔ سیکھانئی چلے ایسو، آمی تتکھن بھیترئیے تھا کبو۔'' (بیٹی! باہر دائیں طرف جھرنا ہے، وہیں چلے جاؤ۔ میں تب تک اندر ہی رہوں گا)

ضرورت سے فارغ ہوتے ہی وہ جھرنے میں نہانے لگی۔ لوٹتے وقت وہ سوچ رہی تھی کہ تنہائی میں مرد اور عورت کی عمر کچھ بھی ہو، رشتے صرف ایک ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اس نے 'عورت' کے رشتے پر 'بیٹی' کے رشتے کو ترجیح دی تھی........اس وقت اُسے گھر کی یاد آرہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن ان آنسوؤں میں اب مشعل والے کا چہرہ جھلملا رہا تھا۔ اب اُسے یہ جاننے کی جلدی تھی کہ یہ شخص کون ہے اور اس ویرانے میں اکیلے کیوں رہتا ہے؟ ڈُمری نے اِس بار ہندی میں پوچھا تھا اس لئے مشعل والے نے اُسے اُسی بھاشا میں بتایا۔

''میں میٹرک پاس تھا۔ کھیتی باڑی کے ساتھ گاؤں کے بچّوں کو فری میں پڑھایا کرتا تھا۔ میرے پتا کو مرغا لڑانے کا شوق تھا۔ میں کئی بار اُن کے ساتھ دیکھنے گیا تھا۔ اُن کے دیہانت کے بعد میں سارے مرغے بیچ دینا چاہتا تھا۔ لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ ان مرغوں کو بیچوں گا نہیں، بلکہ پتا جی کو شردھانجلی دینے آٹھوائر (کوک پٹ) جاتا رہوں گا ______ پہلا دن میرے لئے اچھا ثابت رہا۔ ایک ہی مرغے سے تین بار لڑائی جیتی۔ میں نے اپنے کائتھ کار (چاقو باندھنے والے اور لڑانے والے) کو جیتے ہوئے مرغے کی ایک ایک ٹانگ کاٹ کر نشانی کے طور پر دی۔ گھر آکر میں نے اپنے مرغے کی مرہم پٹّی کی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ تینوں مرغے دلبر منڈا کے آدمیوں کے تھے۔ یوں تو لڑائی کے وقت وہ ہمیشہ وہاں موجود رہتا تھا۔ لیکن بدیسی نسل کی ایک کُتیا اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ہار کی خبر ملتے ہی وہ غصّے سے پاگل ہو گیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی ایک مرغے نے باری باری سے اس کے تین اصیل نسل کے قیمتی مرغے کو ہرایا تھا۔ ہر بازی میں رقم دُگنی ہوتی چلی گئی تھی۔ پہلی میں

پانچ، دوسری میں دس اور تیسری میں بیس ہزار۔یعنی کُل پینتس ہزار روپئے دلبر منڈا کے لوگ مجھ سے ہارے تھے۔''

جیت کا نشہ مجھ پر چھایا ہوا تھا۔دوسرے ہفتے دلبر منڈا پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بلوایا اور کہا۔''تومار جیت کا رمُرگی ٹا انیک پرسنسا سینیتھی کے ایکی بارے لادا پیٹ تھیکے بار کورے دے، کِنتو آج کیر پُرکچھا آمار مُرگی ساتھے۔''(تمہارے جیت کار مرغے کی کافی تعریف سنی ہے کہ ایک ہی وار میں لادا پیٹ سے باہر نکال دیتا ہے۔لیکن آج اصل امتحان میرے مرغے کے ساتھ ہے۔''

''دِلبر بابو!ایٹا ٹھیک جے آمار مُرگا پرتیک لڑائی جیتے چھے۔کائتھ ٹا سوجا پیٹے لاگیئے دیئے۔''(دلبر جی! یہ سچ ہے کہ میرا مرغا ہر امتحان میں پاس ہوا ہے۔سیدھے کائتھ پیٹ میں گھسیڑ دیتا ہے)

''ٹھیک آچھے تومار مُرگا راو پر جُدی ایتٹا بھروسہ آچھے تا ہولے رئیل بازی جے کیؤ ہاربے، گرام چھوڑے جیتے ہوبے۔''(ٹھیک ہے تیرے مرغے میں اتنی اکڑ ہے تو لگی بازی۔ جو ہار گیا اُسے گاؤں چھوڑنا پڑے گا)

''نا، نا......ای گرام ٹا آمار۔آر ایک ٹامُرگا ہیرے کینو کیؤ گرام چھیڑے چلے جابے۔''(نہیں، نہیں .....یہ گاؤں میرا ہے اور ایک مرغ کے ہار جانے سے کوئی گاؤں کیوں چھوڑے گا)

''گیل ناسب ......آمی تو بوچھی، مُرگا ٹا آما کے بکری کرے دیئے۔ایکھون تھیکے کیٹے پوڑو۔ایتیئی تومار منگل ۔آرے تومار بابا آج پرجنتو آمار ساتھے لاگار چیسٹا کرینی۔''(پھٹ گئی نا......ساری اکڑ گھُس گئی نا اُس میں ....میں تو کہتا ہوں کہ بھلائی اِسی میں ہے کہ مرغا مجھ سے بیچ دو اور چلتا بنو یہاں سے۔تمہارے باپ نے بھی کبھی مجھ سے بھڑنے کی کوشش نہیں کی)

''نا، نا۔آمی تومار ساتھے لڑائی کورچھی نا ۔آمی تو اےئی مُرگی ٹا لگاتے ایسے

چھلام۔'' (نہیں میں آپ سے بھڑ کہاں رہا ہوں۔ میں تو بس یہاں مرغا لڑانے آیا تھا)
''مُر گی ٹا لڑاؤ نا ہولے ہوئے جا ک ا یکبار۔ ایکئی ویاپار۔ ایکھن مُر گی ٹا نا لا گیئے تُمی ایکھن تھیکے جابے نا۔'' (مرغا لڑاؤ یا پھر دو دو ہاتھ کرو۔ بات ایک ہی ہے۔ اور اب تم بغیر لڑائے یہاں سے جا بھی نہیں سکتے) دلبر منڈا تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پھر آگے بڑھ کر اس نے مائک سنبھال لیا۔ اُس وقت تک ہزاروں لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ......''جوہار......(جواب میں چاروں طرف سے ویسی ہی آواز گونجی، 'جوہار')'' آج ایئی آٹھوائیرے سیئیٹا ہوبے، جا آج پر یجونتو ہوئینے۔ ایئی لڑائی آمار اور ماسٹر یرمود جیے، جار مُر گا ہارے او کے گرام چھاڑتے ہوبے۔'' (آج اس 'آٹھوائ' میں وہ ہو گا جواب تک نہیں ہوا۔ یہ بازی 'میرے' اور 'ماسٹروا' کے بیچ ہے۔ جس کا مرغا ہار جائے گا اُسے گاؤں چھوڑنا پڑے گا)

لوگوں نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کی بازی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ حیرت زدہ تھے۔ کچھ کے لئے تفریح۔ جن لوگوں نے گزشتہ ہفتے میرے مرغے کو لڑتے ہوئے دیکھا تھا اس نے بڑی بڑی بازی لگا لی۔ لیکن چمچے مسکرا رہے تھے کہ اُنہیں پہلے سے معلوم تھا کہ بٹن دبتے ہی زہریلی سوئی نکلی اور کام تمام ....میرے مرغا کے ہارتے ہی دلبر منڈا اور اُس کے آدمیوں نے مجھے دھکّے مار مار کر گاؤں سے باہر نکال دیا۔ تب سے یہی میرا مسکن ہے۔ حالاں کہ لال گلیارے کے لوگ آئے تھے۔ مجھے ساتھ لے بھی گئے۔ لیکن جب لگا کہ میں کسی کام کا نہیں ہوں تو مجھے چھوڑ دیا۔ میں چاہتا تو اُن لوگوں کے ساتھ مل کر دلبر اور اُس کے آدمیوں کو سبق سکھا سکتا تھا۔ لیکن میں اپنے اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا۔ مہینے دو مہینے میں کبھی کبھار وہ لوگ یہاں آتے رہتے ہیں۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ کوئی تمہیں اپنی پتنی بنانے کے بارے میں سوچ لے تو اپنے اڈّے پر اُٹھا کر لے جائے۔''

''گولی مار دے تو مار دے، لیکن میں ان لوگوں کے ساتھ جانے والی نہیں۔''

اور پھر ایک دن ایریا کمانڈر اُسے خود لینے آ گیا۔ لیکن بابا نے یہ کہہ کر کہ 'اندھی

لڑکی کو لے جا کر کیا کرو گے؟ گاؤں سے باہر نکالتے وقت اتنا مارا پیٹا گیا کہ بے چاری کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی _____ اُس وقت ڈُمری نے بھی اچھی ایکٹنگ کی تھی۔اور ایریا کمانڈر بھی سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اندھی لڑکی اس کے کیا کام آسکتی؟

ایک دن گاؤں کی یاد جب بے حد ستا رہی تھی تو ڈُمری نے پوچھا۔''بابا ان چودہ برسوں میں کبھی تم نے گاؤں لوٹنے کی کوشش نہیں کی؟''

''بس ڈر سے بٹیا! کہ گاؤں گھستے ہی کہیں تیر سے میرا سینہ چھلنی نہ ہو جائے۔''

''لیکن میں موت سے نہیں ڈرتی۔اگر تم میرا ساتھ دو بابا تو میں گاؤں جا کر رہوں گی۔بازی بھی اُس کی ہوگی۔اکھاڑہ بھی اُسی کا۔لیکن جیت ہماری ہوگی۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے بٹیا۔''

''جانتی ہوں۔پھر بھی چاہتی ہوں کہ تم میرے لئے ایسا مرغ تیار کرو جو کسی سے نہیں ہارے۔اپنے بابا سے تو تم نے بہت کچھ سیکھا ہوگا نا؟''

''مرغ کی تیّاری میں کم سے کم ایک سال کا وقت چاہئے اور ساتھ میں پیسے بھی۔ ایک لڑاکو مرغا میں کم سے کم پانچ سے دس ہزار روپئے لگیں گے۔تین چار تو خریدنا ہی ہوگا۔ اتنے پیسے آئیں گے کہاں سے؟''

ڈُمری چُپ ہوگئی تھی۔اُس رات اُسے نیند نہیں آئی۔لیکن دماغ جاگتا رہا........

''بابا! سو گئے ہو کیا؟ تم نے کہا تھا نا کہ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ سمجھو پیسے آ گئے؟'' بابا کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے آگے کہنا۔''ہم دونوں بھیس بدل کر پاس کے شہر جمشید پور جائیں گے۔پانچ چھ مہینے بھیک مانگیں گے اور اُسی پیسے سے اصیل نسل کے دو چار مرغے خرید لیں گے،اس میں سے جو سب سے خوں خوار ہوگا،اُسے جی جان سے ٹرینڈ کرنا تا کہ وہ کاتھ (چاقو) سیدھے دلبر کے سینے میں گھسیڑ سکے۔''

بابا کو ڈُمری کا آئیڈیا پسند آیا۔ڈمری اندھی بیٹی کے رول میں تو پہلے سے ہی تھی۔ بابا کٹورا لئے آگے آگے اور وہ ہاتھ پکڑے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔علاقے کی مناسبت سے

کبھی ''دے اللہ کے نام پر'' اور کبھی ''دے رام کے نام پر'' کا راگ الا پتے رہے۔ رات میں اُٹھ اُٹھ کر کئی بار دونوں پیسے گنتے۔ بار بار گاؤں کا ذکر آتا۔ دونوں ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے۔ دلاسہ دیتے کہ اب ہم جلد ہی گاؤں لوٹیں گے۔

☆

اِدھر ٹوسو پرب کی تیاری اپنے شباب پر تھی اور اُدھر بھکاری کا چولا بدل کر دونوں کورٹ پینٹ، ہیٹ اور رنگین چشمہ پہنے سورن ریکھا ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہنڈیا پاڑہ گاؤں پہنچ گئے۔ بوڑھے کے آدھے چہرے پر جہاں داڑھی تھی وہیں ڈُمری نے جھِل مل کرتے بلیک اسکارف سے چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ صرف دو پُرکشش آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ بوڑھے کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا تو ڈُمری نے لوہے کا پنجڑہ سنبھال رکھا تھا۔ جس میں ایک لال کھڑیا (لال میں سفید کلر والا مرغا) تھا۔ زمین سے کم از کم ڈیڑھ فٹ اونچا۔ دم زمین کو چومتی ہوئی۔

پوس مہینے کا آخری دن تھا۔ فصل کٹائی تہوار کے طور پر بھی 'ٹوسو پرب' کو دیکھا جاتا ہے۔ اس موقع پر کنواری لڑکیاں نئی فصلوں کے پکوان بناتی ہیں۔ نئے نئے کپڑے پہنتی ہیں۔ سج دھج کر لکڑی، بانس اور رنگ برنگے چمکیلے کاغذ سے ٹوسو کا 'علامتی ڈول' تیّار کرتی ہیں۔ دیوی کی طرح سجاتی ہیں۔ سر پر رکھ کر بہادری کے گیت گاتی ہوئی ندی تک آتی ہیں۔ اپنے 'ٹوسو ڈول' کو بہتر بتانے کے لئے ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی بھی ہیں کہ ''میرا 'چاوَرل' تم سے بہتر ہے۔''

ٹوسو کی بہادری کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے اور ڈُمری سوچ رہی تھی کہ جب ٹوسو امر ہو سکتی ہے تو وہ 'ہنڈیا پاڑہ' کی 'ڈُمری' کیوں نہیں بن سکتی۔

یو پی کی ایک حسینہ بوڑھے باپ کے ساتھ ''ٹوسو مرغ میلہ'' میں مرغا لڑانے آئی ہے اور داؤں بھی لاکھ سے اوپر کا لگانا چاہتی ہے۔ یہ بات جب دلبر منڈا تک پہنچی تو اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ہاتھ میں کھجلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

''ٹوسومرغ میلہ''میں خونی کھیل دیکھنے کے شوقین جمع ہونے لگے تھے۔ بارہ بجتے بجتے''آٹھوائر'' کے چاروں طرف ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھیرا بند ہو گئے۔ دلبر منڈا نے دونوں کو بلوا کر''جوہار'' سے سواگت کیا۔''جوہار کا مطلب......''ڈُمری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ دلبر منڈا کے دائیں طرف کھڑے ایک چمچے نے سمجھایا۔''جھارکھنڈی بھاشا میں نمستے کو کہتے ہیں۔''ادائے دلبری سے ڈُمری نے جواب دیا۔''اچھا اچھا! تو میری طرف سے بھی مُنڈے کو لکھنوی آداب کہو۔''

''مُنڈے صاحب! جب سے میری بیٹی نے اس خونی کھیل میں آپ کی شہرت سنی ہے۔ دیوانی ہو گئی ہے۔''

''بس اسی لئے میں آئی ہوں کہ دیکھوں تو کہ وہ دل گردہ والا انسان کون ہے جو 'گاؤں' کی بھی بازی لگا دیتا ہے۔''ترچھی نظروں سے اُس نے دلبر کو دیکھا۔

''ارے میڈم جی! اپنے دلبر جی جیسا دلیر تو اس پورے گاؤں میں آپ کو ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ ویسے اُس دن قسمت اچھّی تھی ورنہ بازی پلٹ بھی سکتی تھی اور ماسٹر واکے بجائے گاؤں والے اِنہیں پیٹ پیٹ کر باہر کر دیتے۔'' چمچے نے پان میں رنگے اپنے پورے دانت باہر نکال دیئے تھے۔

''یہ ماسٹر کون تھا؟''بابا نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''سالا جھولا چھاپ ماسٹر تھا۔ ہارنے کے بعد بھی گاؤں چھوڑنے کے لئے تیّار نہیں تھا۔'آٹھوائر' میں کئے گئے وعدے کو یہاں 'دیوتا کا قانون' سمجھا جاتا ہے۔ وعدہ خلافی کا مطلب 'دیوتا کا اپمان' کرنا ہے۔ ایک بار جہاں دیوتا ناراض ہوا تو مانیتا یہ ہے کہ گاؤں میں پھر کبھی بارش نہیں ہوگی۔ ایسی وبا پھیلے گی کہ ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچے گا۔''دلبر منڈا نے اُسے سمجھایا۔

''ایسی بات ہے تو پھر لگی بازی........''ڈُمری نے مسکراتے ہوئے دلبر منڈا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔''اگر میں ہاری تو زندگی بھر گاؤں نہیں جاؤں گی اور تمہاری داشتہ بن کر

یہیں رہوں گی۔ لیکن مُنڈے! اگر تم ہارے تو تمہیں بھی ماسٹر جی کی طرح اس گاؤں کو چھوڑ نا ہوگا۔''

دلبر منڈا کو ایسا لگا جیسے کانٹے میں چارہ ڈالے بغیر ہی سُنہری مچھلی اس کی بنسی میں پھنس چکی ہے۔ خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ ہار ممکن نہیں اور جیت کا منتر بڑے کائتھ کار کی آستین میں چھپا ہوا وہ بٹن ہے جس کے دبتے ہی بریف کیس کے لاکھوں روپئے کے ساتھ گدرائی لکھنوی حسینہ اس کی گود میں آ گرے گی۔

دلبر منڈا کو جلدی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اعلان کر دیا۔ بازی لگتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے 'آٹھوائز' گونج اُٹھا۔ لوگوں کا جوش وخروش دیکھنے لائق تھا۔

پرمپرا کے مطابق دو کائتھ کار سامنے آئے۔ ایک نے دلبر منڈا کے کالا کُھڑیا (کالے میں سفید رنگ والا مرغ) کو پکڑا اور دوسرے نے ڈُمری کے لال کُھڑیا (لال میں سفید رنگ والا مرغ) کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن ڈُمری نے لال کھڑیا کو دینے سے انکار کر دیا اور بولی۔ ''وہ لڑنے سے پہلے اپنا مرغ کسی کو چھونے نہیں دیتی۔ اس کے کائتھ کار اس کے بابا ہوں گے جو مرغ کے پیروں میں کائتھ باندھیں گے۔'' دلبر منڈا کے کائتھ کار نے کالا کُھڑیا کے پیر سے رسّی کھولی اور ٹانگ کے پیچھے نکلے آل کے ساتھ ملا کر ڈھائی انچ کا کائتھ باندھ دیا۔ پیر سے کھولی گئی رسّی دلبر مُنڈا کے حوالے کیا۔ جسے اُس نے دائیں پیر کے نیچے جیت کے شگون کے طور پر کس کر دبا لیا۔ لیکن ڈُمری نے ایسا نہیں کیا۔ دلبر منڈا کو اس بات کا اطمینان ہوا کہ پہلی جیت کی اینٹ رکھ دی گئی ہے۔ لوگوں کا ایسا ماننا ہے کہ رسّی کو پیر میں دبا کر رکھنے سے ہی جیت ملتی ہے ـــــــ ابھی دونوں مرغوں کے چونچوں کا ملاپ کرایا جا رہا تھا اور دونوں اپنی تیز چونچوں سے ایک دوسرے کی گردن کی چمڑی اُدھیڑ دینا چاہتے تھے کہ تبھی ڈُمری نے بریف کیس سے آئینہ نکالا اور اس سے پہلے کہ دونوں مرغ کو لڑنے کے لئے چھوڑا جاتا۔ وہ چیخ اُٹھی۔ ''ٹھہرو!'' اور سب کچھ ٹھہر گیا۔ ''اِس میں، میں دیکھ رہی ہوں کہ کوئی اِس بھیڑ میں ایسا ہے جو فل آستین کا شرٹ پہنے ہوئے ہے اور اُس کی آستین کے نیچے

ایک پتلی سی نلی ہے۔جس میں زہریلی سوئی ہے۔اس کا کنکشن آستین کے بٹن سے ہے۔بٹن دبتے ہی وہ سوئی میرے مرغ کے سینے میں اُتر جائے گی۔''

اس نے آئینہ چاروں طرف گھما کر دکھایا۔لیکن لوگوں کو کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ لوگ اُچک اُچک کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے تبھی ڈُمری نے اس کے اُوپر اس طرح انگلیاں نچائیں جیسے اس میں کوئی کی بورڈ ہو۔پھر چلاّ کر بولی۔''یہ سیفٹی میرر ہے۔ابھی نیا نیا لانچ ہوا ہے جو ایسے وقت میں مالک کو دھوکے سے آگاہ کرتا ہے۔میں نے 'ریٹرن کمانڈ' دے دیا ہے۔جیسے ہی دھوکے باز شخص بٹن دبائے گا،زہریلی سوئی میرے مرغ کی طرف بڑھنے کے بجائے لوٹ کر اُس کی گردن میں دھنس جائے گی۔اِس لئے اب بے فکر ہو کر میرے مرغ لڑایا جائے۔''

جس شخص نے آستین کے نیچے زہریلی سوئی چھپا رکھی تھی موت کے خوف سے تھرتھرانے لگا۔گلا خود بخود سوکھنے لگا۔دلبر منڈا کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔اُسے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔لیکن بازی لگ چکی تھی اور اس وقت تک دونوں مرغ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے تھے۔نیم کے مطابق لڑائی بیچ میں روکی نہیں جاسکتی تھی۔

قریب دس منٹ تک یہ خونی کھیل جاری رہا۔شروعاتی دور سے ہی دلبر منڈا کا 'کالا کھڑیا' جیتتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔اُس نے اپنے کانٹھ سے ڈُمری کے 'لال کھڑیا' کو لہولہان کر دیا تھا۔لیکن ایسے میں بھی 'لال کھڑیا' نے ہار نہیں مانی۔وہ گرتا پڑتا لڑتا رہا اور 'کالا کھڑیا' کے تیز دھار دار کانٹھ کے بھرپور وار سے خود کو بچاتا رہا۔وہ تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔'کالا کھُڑیا' کی جیت لگ بھگ طے مانی جارہی تھی۔

آستین میں زہریلی سوئی چھُپائے شخص کے اندر سے موت کا خوف غائب ہو گیا تھا اور گلے میں شہد گھلنے لگا تھا۔دلبر مُنڈا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔رسّی کو زور سے دباتا جارہا تھا تاکہ جیت جلدی مل جائے۔

ڈُمری اور بابا نے جب لال کھڑیا کو ہارتے دیکھا تو وہ اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے تھے جیسے اُن کے جسم میں خون ہی نہ ہو۔ ایک دوسرے کی طرف بھی دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ ساری پلاننگ ریت کی طرح بکھرتی جارہی تھی۔ مکھوٹا اُترتے ہی موت کا ڈر بھی ستانے لگا تھا۔ چمچے نعرہ لگاتے ہوئے جیت کے نشے میں چاروں طرف کھڑے ہو گئے تھے کہ اِدھر جیت ہوئی نہیں کہ اُدھر وہ لکھنوی حسینہ کو اُٹھا کر دلبر مُنڈا کی گود میں ڈال دیں گے۔

لال کھڑیا لگ بھگ ہار چکا تھا۔ لیکن ایسے میں پہلی بار یہ دیکھا گیا کہ سارا گاؤں 'لال کھڑیا' کی جیت کے لئے اپنے'' گاؤں گرام تھان'' (علاقائی دیوتا) سے پرارتھنا کر رہا تھا___ پھر اچانک کچھ ایسا ہوا کہ خون سے لت پت 'لال کھڑیا' نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر ایسی چھلانگ لگائی کہ ڈھائی انچ کا کانٹھ سیدھے' کالا کھڑیا' کے سینے میں پیوست ہو کر چیرتا ہوا لادے کے ساتھ باہر نکل گیا۔

اِس جیت کے ساتھ پورا' آٹھوائز' ڈُمری کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ ہزاروں کا مجمع منچ پر ٹوٹ پڑا۔ چمچے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دلبر مُنڈا نے بھی بھاگنے کی کوشش کی۔ ریوالور نکال کر ڈُمری کو ڈھال بنالیا۔ لیکن وہ خوف زدہ نہیں ہوئی۔ بابا نے جان جوکھم میں ڈال کر دلبر مُنڈا کا آخر کار دبوچ لیا۔

ناچ گانا اور بینڈ باجے کے ساتھ دلبر منڈا کو ننگا کر کے گاؤں میں گُھمایا گیا اور پھر گاؤں کی سرحد سے دور اُسی جگہ لایا گیا جہاں.........اس وقت ڈُمری کی پُشت پر سارا گاؤں کھڑا تھا۔

☆☆☆

پانی والا انکل

سرکاری رحمت نلوں کے راستے گھر گھر اُترنے والی تھی۔
آزادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا اس لئے ہر طرف جشن کا ماحول تھا۔ بچّے جوان بوڑھے سب خوش تھے۔ اچھّے دن آنے کی خوشی میں کچھ نعرے لگا رہے تھے اور کچھ ناچ گا رہے تھے۔ سب سے زیادہ خوش پانی والا انکل تھا جو خوشیوں سے پاگل ہو رہا تھا۔ اور پاگل ہونے کی بات بھی تھی کہ وہ اب عمر کی ساٹھویں سیڑھی سے قریب تھے اور تقریباً تیس سالوں سے 'پبلک ہیلتھ انجینیئر نگ ڈیپارٹمنٹ' کے چکّر کاٹتے آ رہے تھے۔ نیتاؤں سے مل رہے تھے کہ اس کے محلّے میں بھی سرکاری رحمت کے مین پائپ پہنچ جائے۔ لیکن کسی افسر نے فریاد نہیں سنی۔ ایم پی، ایم ایل اے نے انتخابی موسم میں ہر گلی کوچے میں جھوٹے پانی کے پائپ ضرور بچھوائے۔ مفت میں پانچ سو لیٹر پانی کا چناوی وعدہ بھی کیا۔ لیکن کاغذ پر نہ کبھی نقشہ پاس ہوا، نہ ٹینڈر اور نہ ہی پائپ بچھے۔ پھر ایسے میں سرکاری رحمت کی بوندیں نلوں کے راستے گھر گھر کیسے ٹپکتیں۔
لیکن اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔
سرکاری رحمت گھر گھر اُترنے والی تھی۔
گاؤں کا ہر شخص خوش تھا کہ اب نہ پانی کی قلّت ہوگی اور نہ دور دراز جانا پڑے گا۔ بلکہ چاروں طرف پانی کی ایسی افراط ہوگی کہ دو چار دہائی سے چوہا اسنان کرنے والے بھی گنگا میں ڈُبکی لگاتے دکھائی دیں گے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ پانی والا کس شخصیت کا

مالک ہوگا ....دیکھنے میں بالکل سیاہ تھا۔ بال گھنگھریالے اور دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے۔ کان کچھ حد تک چوڑے۔ آنکھیں بڑی اور سفید۔ قد درمیانہ اور کاٹھی بے حد مضبوط ۔لیکن ساٹھ سے تجاوز کرتے ہی کمر جھکنے لگی تھی۔ ہاتھوں میں گٹھّے تھے۔ پاؤں نے کبھی چپّل جوتا نہیں دیکھا۔ کاندھے پر ہمیشہ گمچھا جھولتا رہتا۔ سائکل کے دونوں طرف دو دو گیلن پینتس پینتس لیٹر کے لٹکے ہوتے۔ قریب ڈیڑھ سو لیٹر پانی وہ ہمیشہ اپنی طاقت کے پیڈل سے کھینچتا۔ جہاں تھک جاتا وہاں وہ کسی دیوار یا پیڑ کے سہارے سائکل اسٹینڈ کر کے کچھ دیر آرام کرتا۔ گمچھے سے منہ ہاتھ پونچھتا اور ہینڈل میں الگ سے لٹکائے پانچ لیٹر والے گیلن سے پانی پیتا۔ راحت جیسے ہی گلے کے راستے دماغ تک پہنچتی تو وہ زنگ آلود سائکل کو کھینچتا ہوا ایک بار پھر آگے بڑھ جاتا۔ ایک سو اکلومیٹر کا یہ سفر اور وہ بھی دن میں کئی کئی بار۔ جب بھی وہ پانی سے بھرے گیلن لے کر محلّے میں داخل ہوتا لوگ منّت سماجت کرتے کہ جتنے پیسے چاہئے لے لو، لیکن پانی....... وہ ہر رات ضرورت مندوں کی فہرست دماغ میں تیّار کرتا اور ایک بار جو سوچ لیتا کہ پہلے کس گھر میں پانی پہنچانا ہے۔ کچھ لوگ اس کی حرکتوں سے پریشان ہوتے تو کچھ خوش کرنے کے لئے اُسے چائے پلاتے۔ پیسے کا لالچ دیتے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی مرضی کی کرتا۔ کسی کی نہیں سنتا۔

اندھیرے میں اسے کوئی سائکل کھینچتے ہوئے دیکھ لے تو ڈر جائے۔ لیکن رات کی سیاہی چھٹتے ہی ہر کسی کو اسی کا انتظار رہتا۔ سائکل کی گھنٹی سننے کے لئے لوگ بے چین رہتے۔ زنگ آلود سائکل جس میں جگہ جگہ کالا رنگ پُتا ہوا تھا اس کی ایک طرف دوا اور دوسری طرف دوا ایس (S) ٹائپ ٹک لٹکا رہتا۔ شرٹ گہرے رنگ کی پہنتا اور لنگی چارخانے والی۔ وہ بھی ٹیری کاٹ۔ جسے موڑ کر دوبارہ کمر میں گانٹھ لگا دیا کرتا تاکہ سائکل کھینچنے میں آسانی ہو۔

پانی والا انکل جب پچیس تیس سال کا تھا تب گھر والے اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ راضی نہیں ہوا کہ ’’شادی کے بعد آدمی اندر سے کمزور ہو جاتا ہے اور اس کا کام تو محنت کا ہے۔ اس کے لئے تندرستی پہلی شرط ہے۔ اس کی وجہ سے کسی کو ’پانی‘ کے

لئے تکلیف ہو وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر بیوی کے نخرے۔ بچّے اور ساتھ میں ہر روز نت نئے مسائل۔ وہ اپنے کام کے راستے میں کسی کو حائل ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ حالاں کہ گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ شام ڈھلے تھکے ہارے جب گھر لوٹو گے تو بیوی کھانا نکال کر دے گی ،۔ ہاتھ پاؤں دبائے گی ۔ سر میں تیل ڈالے گی ۔ مالش کرے گی ۔لیکن اس نے کسی کی نہیں مانی ۔

یہ اس کے روز کا معمول تھا.......

دوپہر کھانے کے بعد وہ پانچ منٹ کے لئے ہی سہی ،لیکن 'پی ۔ ایچ ۔ ای ۔ ڈی 'دفتر کے چکّر ضرور کاٹتا ۔ حالاں کہ دفتر کے لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے ۔لیکن کسی میں منع کرنے کی ہمّت نہیں تھی ۔صرف بوڑھے چپراسی کو اس کا انتظار رہتا ۔ایک گیلن پانی مفت میں ملتا تھا ، جس کے عِوض وہ اندر کی ساری باتیں بتا دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایکزی کیوٹیو انجینیئر سے بھی اس کا آمنا سامنا ہو جاتا۔ ''سلام صاحب'' کے بعد ان سے بھی وہ وہی سوال پوچھتا۔ ''ہمارے محلّے میں پانی کا کنکشن کب لگے گا۔'' اور ہر بار وہ اسے تسلّی دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

''فائل منسٹر کے پاس ہے۔''

''اس بار لگ ہی جائے گا نا صاحب!''

''ہاں ہاں لگ جائے گا۔لیکن تم پریشان کیوں ہو.......؟''

''کیوں نہ رہوں صاحب۔'' ہاتھ دکھاتے ہوئے۔ ''دیکھو صاحب! کیسا گھٹّا پڑ گیا ہے ۔ بہت درد کرتا ہے صاحب ۔ کبھی کبھی خون بھی رستا ہے ۔ پانی آ جائے گا تو مجھے آرام مل جائے گا صاحب۔''

اس دن پانی والا انکل رات نو بجے کے قریب پانی پہنچا کر جب محلّے کے صدر چوک پر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ پہلے سے ہی اس کے انتظار میں ہیں۔ یہاں اکثر دس بیس لوگ بیٹھے ہوتے ۔ جس میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جنہیں کل پانی کی زیادہ

ضرورت ہوتی۔ وہ منّت سماجت کر کے پہلے ہی حامی بھروالینا چاہتے تا کہ انہیں پریشانی نہ ہو۔ کچھ لوگ اس لئے بھی بیٹھے ہوتے کہ پانی والا چائے پینے کے دوران وہ خبریں نشر کرتا ہے جو اسے بوڑھے چپراسی سے پانی کے عِوض موصول ہوتی تھیں۔

ایک دن جیسے ہی پانی والا انکل وہاں پہنچا پیپل والے چبوترے سے اُتر کر ایک نوجوان سامنے آ گیا۔

''سلام انکل!''

''خوش رہو بیٹا۔''

کچھ شرماتے ہوئے۔''انکل کل سسرال سے کچھ لوگ آ رہے ہیں اگر آپ.......''

''بس بس میں سمجھ گیا۔ دو چار گیلن زیادہ پانی چاہئے۔ یہی نا.........''

''ہاں انکل! آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔''

''مہربانی وہربانی چھوڑو۔ ایکسٹرا جو گیلن ہوں گے اس کے دُگنا پیسے لگیں گے۔ سمجھے۔''

لیکن اس کے باوجود کبھی کوئی استفسار نہیں کرتا کہ دُگنا کیوں؟ فوراً حامی بھر لیتے۔ لیکن جب حساب کتاب کی باری آتی تو وہ ایکسٹرا گیلن کے پیسے نہیں لیتا۔ کہتا۔'' آپ کے سسرال والے مطلب ہمارے سسرال والے۔ کیا ہم اپنے سسرال والوں سے نہانے دھونے کے پیسے لیں گے۔''اس جواب کے سامنے سب لاچار ہو جاتے۔ لیکن کوئی جھوٹ بول کر یا طاقت کا زور دکھا کر اس سے ایکسٹرا گیلن نہیں منگوا سکتا تھا۔ بہت پہلے دو چار نے جرأت کی تھی۔ اس نے اس سے ایکسٹرا پیسے بھی لئے اور پانی دینا بھی چھوڑ دیا۔ اس کی ضد کے آگے سفید پوش نیتا کی دبنگئی بھی کوئی کام نہیں آئی تھی۔ اس لئے لوگ سچ بولتے تھے۔ پھر گیلن کی قیمت اتنا مناسب تھی کہ غریب بھی رابطہ استوار کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ دو چار گھر ایسے تھے جہاں وہ پہلے پانی پہنچاتا۔ لیکن نہ کبھی گیلن کی گنتی کرتا اور نہ ہی ان سے پیسے لیتا۔ اس میں ایک گھر اس بوڑھی بیوہ کا بھی تھا۔ جہاں سب سے پہلے ساڑھے چار بجے

صبح پانی لے کر جاتا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی جوان خوبصورت بیٹی جس کی شادی اپاہج پن کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی، اسے وہ پسند کرتا ہے۔ جب بھی وہ پانی لے کر پہنچتا بوڑھی بیوہ ہی اسے جگی ملتی۔ بیس پچیس سالوں کے اس طویل عرصے میں کبھی کبھار ہی اس کی بیٹی سے اس کا سامنا ہوا۔ وہ بھی اس وقت جب بوڑھی بیمار پڑ جاتی اور مجبوراً اسے اُٹھ کر لنگڑاتے ہوئے دروازہ کھولنا پڑتا تھا۔ پانی والا اسے دیکھتے ہی مسکراتا۔ بوڑھی کے بارے میں پوچھتا ۔ پھر گیلن کا پانی ڈرم میں ڈال دیتا۔ باہر نکلتے وقت اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ ''بیٹی دروازہ بند کرلو۔''

محلے کا وہی صدر چوک........

پیپل کا وہی چبوترہ........

چائے کی دکان پر سائکل روکتے ہی شکور چاچا نے پوچھا۔

''کیا خبر ہے کلّو میاں! پانی وانی آئے گا اپنے محلّے میں؟''

''ارے شکور بھائی! یہی خوش خبری تو دینے آیا ہوں ۔آج کسی وجہ سے 'پی۔ایچ۔ای۔ڈی' پہنچنے میں لیٹ ہوگیا۔ پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ میں وہاں چھ بجے پہنچا۔ تالا لگا ہوا تھا۔ ابھی میں پیڈل پر زور لگا کر تیزی سے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ایکزیکٹیو انجینیئر صاحب اچانک سامنے آ گئے۔ انہوں نے ہینڈل تھام لیا۔ مجھے لگا کہ مذاق کر رہے ہیں۔لیکن وہ تو سریس تھے۔ بولے۔

''ہر روز دفتر کا چکر کاٹتے ہو۔ پر آج کہاں تھے.......کل کے اخبار میں سب کچھ آ جائے گا۔لیکن تم محلّے والوں کو بتا دینا کہ فائل پر سائن ہو گیا ہے۔ ہفتہ دو ہفتہ میں ٹینڈر ہو گا اور کام مہینے دو مہینے میں شروع ہو جائے گا۔ اوپر سے کام جلدی کرنے کا پریشر بھی ہے۔ اس لئے پانچ چھ مہینے میں پانی بھی گھر گھر پہنچ جائے گا۔''

''سچّی صاحب؟''

''کل دفتر آ کر فائل دیکھ لینا۔''

''صاحب اگر پڑھا لکھا ہوتا تو ہم بھی آفس میں بابو ہوتا صاحب۔فائل وائل چھوڑو۔ سچی سچی بتاؤ نا صاحب......؟''

''تمہیں کیا لگ رہا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''نہیں صاحب ! ایسی بات نہیں ہے۔پوری زندگی محلّے میں پانی نہیں دیکھا ۔اس لئے تھوڑا ڈر لگ رہا ہے صاحب۔کیوں کہ بھوٹ کے ٹائم کئیوں نیتا نے وعدہ کیا تھا صاحب۔بس اس لئے.......لیکن آپ تو نیتا نہیں ہیں نا صاحب۔اس لئے سچّی ہی بولے گا نا صاحب۔''

پانی والا انکل زور زور سے اپنی بات کہہ رہا تھا اور ہنس ہنس کر اپنی خوشی کا اظہار بھی کرتا جا رہا تھا۔

''تو اس کا مطلب کہ اب گھر گھر پانی آ جائے گا۔''ایک نوجوان نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا!تم سچّی کہہ رہا ہے۔مجھے بھی آرام ملے گا۔اب اس عمر میں اتنا کام نہیں ہوتا ہے۔بہت تھک جاتا ہوں۔رات میں سوتا ہوں تو جسم اتنا دکھتا ہے کہ کیا کہوں۔لگتا ہے کہ صبح اُٹھ نہیں پاؤں گا۔لیکن وقت پر نہ اُٹھوں اور لوگوں کو پانی کیسے ملے گا۔''

محلے کا وہی صدر چوراہا.......

لوگوں کی بھیڑ اسی طرح لگی ہوئی تھی۔

ہر کوئی ایک نظر پاس ہوئے نقشے پر ڈال لینا چاہتا تھا۔یہ نقشہ پانی والا نے چوراہے کی دیوار پر چسپاں کیا تھا۔اس میں مین پائپ لائن کہاں کہاں سے گزرے گی۔ درج تھا۔

ہر شخص کی نظر ان گلیوں پر تھی جہاں ان کا بسیرا تھا۔

''یار تو تو بہت خوش نصیب نکلا۔مین پائپ تو بالکل تیرے گھر کی دیوار سے سٹ کر جا رہی ہے۔دس بیس فٹ پائپ میں کام چل جائے گا تمہارا۔''

''لیکن میری گلی تک تو پائپ جا ہی نہیں رہا ہے۔ مجھے تو بغل کی گلی سے پائپ

لے جانا پڑے گا۔کم سے کم دوسوفٹ پائپ لگے گا۔''

''چل یار جتنا بھی لگے کوئی بات نہیں۔''

''پانچ سات ہزار کے خرچ میں زنانہ بھی خوش اور ہم سب بھی ٹینشن فری۔''

''ارے خوش کیوں نہیں ہوگی۔باپ دادا کے جمانے میں جو نہیں دیکھ پائی میاں کے جمانے میں جو دیکھے گی۔''

ہنسی کی پھوہار سب کے منہ سے ایک ساتھ چھوٹی۔پانی والا انکل تو سب سے زیادہ خوش تھا کہ برسوں 'پی۔ایچ۔ای۔ڈی' کے چکر لگانے کے نتیجے میں محلے والوں کو یہ تحفہ ملا ہے۔اور محلے والے بھی یہی جانتے تھے۔

پھر کچھ ہی دنوں میں ٹینڈر رہوا........

ٹینڈر رہوتے ہی کھدائی کا کام شروع ہوگیا۔

پانی والا انکل جب بھی سرکاری نلوں سے گیلن بھر کر محلے میں پہنچتا تو خالی گیلن لے کر لوٹتے وقت وہ کھُدے ہوئے گڈھے کے پاس ضرور جاتا۔گہرائی اور لمبائی ناپتا۔مسکراتا کہ یہ گڈھے خوشیوں کا مژدہ لے کر آئے ہیں۔کبھی کبھی وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا۔کھُدائی کرتے ہوئے مزدوروں سے کچھ کچھ پوچھتا۔انہیں جلد سے جلد کھدائی کرنے کے لئے کہتا۔جیسے وہ ان کا ٹھکیدار ہو۔

سرکاری رحمت کو گھر گھر پہنچانے کے لئے اب یہ تیار گڈھے پائپوں کے انتظار میں تھے۔

موٹے موٹے پائپ لے کر جب پہلی بار ٹرک محلّے میں داخل ہوئی تو اُس صدر چوک پر جہاں پائپوں کو اُتارا جانا تھا وہاں پانی والا انکل پہلے سے موجود تھا۔مزدوروں کو پائپ اُتارتے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔جب تک آخری پائپ نہیں اُتارلیا گیا تب تک وہ وہیں کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اب تو ایک گھنٹے میں ہی پورا محلّہ سیراب ہو جائے گا۔کتنا مزہ آئے گا۔وہ بھی دن میں دو تین بار نہائے گا۔اور دن بھر اسی چورا ہے

کے پیپل تلے آرام کرے گا۔لوگوں سے باتیں کرے گا۔

اب تو اس کے روز کا یہی معمول ہو گیا تھا۔

آتے جاتے کبھی ان گڈھوں کو دیکھتا تو کبھی ان پائپوں کو گنتا اور کبھی اُنہیں چھو کر محسوس کرتا اور کبھی کان لگا کر اس کے اندر بہنے والے پانی کی آواز کو سننے کی کوشش کرتا ۔کبھی ہاتھوں سے اس طرح ناپتا جیسے ایک انچ بھی پائپ کم ہو گیا تو اس کی برسوں کی محنت بے کار ہو جائے گی۔اس لئے دن بھر کی تھکاوٹ کے باوجود وہ چوروں کے خوف سے محلے کی گلیوں میں رات بھر گھوم گھوم کر پہرہ دیا کرتا۔

جب پائپوں کو گڈھوں میں اتارنے اور ویلڈنگ کا کام شروع ہوا تو اس کی خوشیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وقت نکال کر وہ وہاں پہنچ جاتا اور دیر تک چنگاریوں کو دیکھتا رہتا۔ پہلے جو خوشیاں اس کے چہرے پر نظر آتی تھیں اب وہ اس کی آنکھوں کے راستے روح میں اُتر کر اس کے ہونٹوں پر نغمے لکھ رہی تھیں۔ جسے وہ ہر پیڈل کے ساتھ گنگناتا رہتا۔

گڈھے کھدیں گے
پائپ بچھیں گے
مجھ کو بھی آرام ملے گا
جب گھر گھر پانی آئے گا........

یہ گانے کے ابتدائی بول تھے۔گاتے وقت اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشیاں رقص کرتیں۔ لوگ آپس میں باتیں کرتے۔ کچھ مذاق اُڑاتے اور کچھ نفع نقصان کے پلڑے میں تولتے۔

''یار پانی والا انکل تو اس طرح خوش ہو رہا ہے جیسے سب سے زیادہ فائدہ اسی کا ہے۔''

''میں تو کہتا ہوں کہ جب نقصان کی مار پڑے گی تو اس درد کو جھیل پانا اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔''

''وہ کیسے......؟''

''ارے یار تم بھی بدھو کے بدھو ٹھہرے، جب گھر گھر پانی آجائے گا تو کیا اس کے بعد بھی لوگ گیلن خریدیں گے؟''

لیکن پانی والا انکل ان باتوں کو ہنس کر اُڑا دیا کرتا کہ ''ایک دروازہ بند ہوگا تو دوسرا کھل جائے گا۔ دنیا میں کام کی کمی تو نہیں ہے۔'' لیکن بعد میں سوچتا کہ وہ کون سا کام جانتا ہے جو کرلے گا۔

پائپ لائن کا کام نقشے کے مطابق چل رہا تھا........

جیسے جیسے انتخاب نزدیک آرہا تھا۔ کام میں تیزی آنے لگی تھی۔ وقت سے پہلے برسرِ اقتدار سیاسی رہنُما اس اہم کام کو ختم کر کے اپنے لئے محلّے کا ووٹ محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ لیکن پانی والا انکل کے ہر روز دفتر جانے کی وجہ سے سرکاری افسروں اور بابوؤں پر دباؤ بڑھا جس کے نتیجے میں نیتاؤں کو مجبوراً پاس کرنا پڑا........ایسی خبروں سے کبھی کوئی سیاسی رہنُما خوش نہیں ہوتا۔ ایک دن پانی والے کو خوشی میں محلے کے دو چار نوجوانوں نے کاندھے پر اٹھا لیا تھا۔ سفید پوش نیتا کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ پانی والا کبھی اس کے یہاں بھی اپنی خدمت دیا کرتا تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے خون پسینے کے پانی سے گاڑی دھوئی جائے۔ احتجاج کرنے پر اس کے گرگوں نے بہت مارا۔ لیکن مار کھانے کے بعد بھی وہ اس کی طاقت کو چنوتی دیتا رہا کہ ''جان سے مار دو لیکن کل سے پانی نہیں دوں گا۔''

آج اسی سفید پوش نیتا جی کو لگ رہا تھا کہ وہی جاہل، گنوار شخص اس کے سیاسی کیریئر پر پانی پھیر رہا ہے۔ اس کے منسٹر نے پانی جب تحفے میں دیا ہے تو اس کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہئے۔ لیکن ....لیکن وہ جانتے تھے کہ ایک بار جہاں اس کے گُرگے گھر گھر گھوم گئے، پھر سب اس کے ہی گن گان کرتے نظر آئیں گے۔

اب سفید پوش نیتا جی کے حکم پر اس کے گُرگے پانی والا کے عمل پر نظر رکھ رہے تھے۔ سب سے اہم خبر پانی والا سے پہلے اناؤنس کر کے وہ اپنی واہ واہی لوٹ لینا چاہتے

تھے......اس لئے اِدھر انہوں نے اپنے ایک چمچہ کو آفس بھیجنا شروع کیا ۔ چپراسی کو دھمکایا گیا کہ ''اگر خبر لیک ہوئی تو اس کی زندگی کا بلاڈر بھی لیک ہو جائے گا۔''

اس دن سب سے اہم خبر چپراسی کے پاس تھی۔لیکن اس نے پانی والا سے جھوٹ بولا۔گیلن لیتے ہوئے چپراسی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پانی والا لوٹ گیا کہ آج نہیں تو کل یہ کام تو ہونا ہی ہے۔

پانی والا انکل کے جاتے ہی چپراسی اندر ہی اندر کرب میں مبتلا ہو گیا کہ اس نے سچ چھپایا تھا۔ بےچینی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔سامنے گیلن تھا۔ لیکن پانی نکالنے کی ہمت نہیں تھی۔ پیاس تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ہمّت کر کے اس نے گیلن اٹھایا۔گلاس میں ڈالا۔ہونٹ تک جیسے ہی لے گیا پانی خون میں بدل گیا .... وہ پسینے سے بھیگنے لگا۔گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا۔کچھ دیر تک کانپتا رہا۔ بڑی مشکل سے حواس کو قابو میں کیا۔پھر سائکل اُٹھائی اور اُن راستوں پر تیزی سے پیڈل مارنے لگا جن راستوں سے ہو کر پانی والا انکل پانی ڈھویا کرتا تھا۔

اب صدر چوک پہ پہلے سے زیادہ لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

اور ہر کوئی اس انتظار میں تھا کہ کب پانی ٹنکی سے مین لائن جوڑی جائے گی۔

سفید پوش نیتا جی کی جیپ اور دو چار گاڑیاں دھول اُڑاتی ہوئی وہاں آکر رکیں۔

''نیتا جی......زندہ باد'' کے نعرے شروع ہو گئے۔پھولوں کا ہار پہنایا گیا۔ چوراہے کا ماحول یکا یک سیاسی رنگ میں تبدیل ہو گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے نیتا جی پیپل والے چبوترے پر چڑھ گئے۔آتے جاتے لوگ بھیڑ کا حصہ بننے لگے کہ آج نیتا جی کون سا کرتب دکھاتے ہیں۔

جب بھیڑ جمع ہو گئی تو سفید پوش نیتا جی نے اپنے کائی زدہ دانت باہر نکالے۔

''بھائیو! ہماری پارٹی نے پچھلے چھ مہینے میں جو کام کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھُپا نہیں ہے۔سرکاری کام تو آپ لوگ جانتے ہی ہیں۔سرکاری بابو کام پورا ہونے کے بعد بھی آج کل کر کے ٹال رہے تھے۔میں نے ایکزیکیوٹیو انجینیئر سے کہہ دیا ہے کہ آج اگر مین ٹنکی

سے پائپ نہیں جوڑا گیا تو میری لاش کو نہلانے کے لئے پانی دینا ہوگا۔کل صبح آٹھ بجے کا ڈیڈلائن میں نے دے دیا ہے۔''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ........

زندہ باد کے نعرے........

نیتا کے بغل میں کھڑا شخص جس نے گلے میں لال رومال باندھ رکھا تھا اس نے پہلے نیتا جی کے کان میں کچھ کہا پھر بولا۔

''کل نیتا جی اسی چوک میں نہا کر ادگھاٹن کریں گے۔آپ سب کو نیتا جی کی طرف سے نمنترن ہے۔''

ایک بار پھر تالیوں کی آواز گونجی........اوراس تالی کی آخری گونج پانی والا انکل کے کانوں تک بھی پہنچی۔وہ بھیڑ کے سب سے آخری سرے پر سائکل تھامے کھڑا تھا۔اسے اس بات کا افسوس تھا کہ اس اہم خبر کو وہ نہیں سنا پایا جسے سنانے کے لئے وہ کئی ماہ سے بے تاب تھا اور آج جیسے ہی راستہ روک کر چپراسی نے بتایا وہ جلدی جلدی صدر چوک کی طرف بھاگا تھا۔لیکن........لیکن اس کے سنانے سے پہلے ہی وہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی۔جو لوگ کل تک راستہ روک روک کر پوچھا کرتے تھے،آج نیتا جی کی باتیں کر رہے تھے........

آج پانی والا انکل جلد سے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی وہ سائکل پر سوار ہونا چاہا اسے لگا بدن اچانک بھاری ہوگیا ہے اور وہ کسی بھی حالت میں اپنی وزنی ٹانگ کو اُٹھا کر سائکل پر سوار نہیں کر سکتا۔جیسے تیسے کر کے اس نے خود کو سائکل پر سوار کیا لیکن لاکھ کوشش کے بعد بھی پیڈل گھُما نہیں پایا۔پھر وہ بغیر سوار ہوئے سائکل کو کھینچتا رہا۔پسینے سے تر بتر۔لوگ دیکھتے رہے۔لیکن کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔شناسا چہرے جنہیں اس کا انتظار رہتا تھا۔وہ سب نیتا کی تعریف میں رطب اللِساں تھے........اس دوران بار بار پانی والا کے کانوں میں نیتا جی کی آواز گونج رہی تھی کہ وہ''صدر چوک کے اس نلکے پر نہا کر ادگھاٹن کرے گا۔''

پورے محلّے میں صرف اس کا گھر تھا جہاں پانی کا کنکشن نہیں لگا تھا۔آٹھ دس ہزار

روپئے کہاں سے لاتا؟ کس کے لئے لاتا؟ گھر میں کون تھا؟ بوڑھے ماں باپ کو اس جہاں سے گئے ہوئے بھی آٹھ دس سال ہو گئے تھے۔اور اب یہ نلکہ بھی اس سے دور ہو رہا تھا۔اس نے ایسا سوچا تھا کہ سب سے پہلے وہ اس نلکے پر نہائے گا........لیکن اب وہ موقع بھی سفید پوش نیتا نے ادگھاٹن کے بہانے چھین لیا تھا۔اپنے جسم کو لاش کی طرح کھینچتے ہوئے اور نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔''کاش اس کے پاس طاقت ہوتی تو وہ اُسے کبھی نہانے نہیں دیتا۔''

کسی طرح وہ گھر پہنچ پایا۔جسم چور چور تھا۔سائکل اسٹینڈ کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔وہ سیدھے چارپائی پر گر گیا۔آج نہ چولہا جلایا اور نہ ہی روٹی سبزی بنائی۔سائکل بغل میں اوندھی پڑی تھی۔پانچ لیٹر پانی والا گیلن ہینڈل کے ساتھ ایک طرف جھک جانے کی وجہ سے اس کا ڈھکن ڈھیلا پڑ گیا۔پانی رسنے لگا۔اسے پیاس لگی تھی۔لیکن اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اُٹھ کر گیلن سیدھا کرے یا ڈھکن ہی ٹائٹ کرے۔رات بھر وہ بغیر بستر کے چارپائی پر بھوکا پیاسا پڑا رہا۔گیلن سے رستے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا.........آنکھیں برستی رہیں۔

صبح کی پہلی کرن پھوٹتے ہی ادگھاٹن کی تیاریاں شروع ہو گئیں.......ٹینٹ لگے۔کرسیاں آئیں۔باجا گاجا کا انتظام بھی ہوا۔

جشن ہی جشن.......

اور بھلا کیوں نہیں ہوتا: نصف صدی کے لمبے انتظار کے بعد سرکاری رحمت نلوں کے راستے گھر گھر اُترنے والی تھی۔

صبح آٹھ بجے سے قبل نیتا جی پندرہ بیس لوگوں کو لے کر صدر چوک پہنچے۔حوالی موالی رہ رہ کر نیتا جی کے لئے نعرے بلند کر رہے تھے۔بچّے، جوان بوڑھے سبھی کے چہرے پر خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔نیتا جی بار بار موبائل میں وقت دیکھ رہے تھے۔ابھی آٹھ بجنے میں پانچ سات منٹ باقی تھا۔

پانی والا رات بھر بستر پر اسی طرح کروٹیں بدلتا رہا تھا۔بھوک سے پیٹ میں

اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ پیاس سے ہونٹ سوکھ کر کانٹا ہوا جا رہا تھا۔ ایسے میں آنکھیں بار بار اوندھے منہ پڑے گیلن کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ پانی فرش پر چاروں طرف پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سفید پوش نیتا کے چیخنے کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''محلے والو! اگر وقت پر پانی نہیں آیا تو میری لاش کو یہاں سے تب تک نہیں اُٹھانا جب تک پانی نہیں آئے......اور آج میں یہ قربانی دے کر رہوں گا۔''

آٹھ بجتے بجتے پورا محلّہ اُمڈ پڑا تھا۔ نیتا جی اب کچھ اور زور سے چیخ رہے تھے اور اس بھیڑ میں پانی والا کو بھی تلاش کر رہے تھے کہ وہ ادگھاٹن کے وقت سامنے کھڑا رہے تو نہانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ سب کے سامنے اُسی سے پانی بھروائے گا۔ گنجی، لنگی اور انڈر ویئر دھلوائے گا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالاں کہ اس نے ایک لڑکا لگا رکھا تھا کہ جیسے ہی نظر آئے وہ اسے نل کے پاس لے آئے۔

وقت پر نہ پانی والا نظر آیا اور نہ ہی نل نے شور مچایا۔ ایسے میں نیتا جی کی حالت پاگلوں جیسی نظر آنے لگی۔ وہ جان دینے کی بات کہہ چکے تھے۔ لیکن جان دینا کسی کے لئے اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس نے غصّے میں فون ملایا تو ایکز یکیوٹیو انجینیئر نے بتایا۔

''ایک نٹ سلپ ہو گیا ہے ہم لوگ لگے ہوئے ہیں۔ بس کچھ ہی دیر میں پانی چھوڑ دیا جائے۔''

''سالا میں یہاں لنگی بنیان میں ادگھاٹن کے لئے کھڑا ہوں اور تم نے ٹائم پرنٹ سلپ کر دیا۔ ابھی جہاں دو چار آدمی وہاں پہنچے تو سارا نٹ ٹائٹ ہو جائے گا تمہارا۔''

''سر! بس کچھ ہی دیر میں........''

''چپ حرام خور........'' اور اس نے موبائل پٹک دیا۔

پانی والا انکل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''سالا! ناٹک کر رہا ہے۔ اتنی ہمت کہاں ہے آج کے نیتاؤں میں کہ پبلک کے لئے جان دے۔'' لیکن یہ آواز اس کے جسم کے حصار کو توڑ کر باہر نہیں نکل پائی تھی۔ اندر ہی اندر گھُٹ کر رہ گئی تھی۔

نیتا جی کا غصّہ اُبال مار رہا تھا کہ ڈیڈ لائن پار ہو گیا تھا اور پانی نہیں آیا تھا۔ لوگوں کی دلچسپی اب اس بات میں تھی کہ نیتا جی کیا کرتے ہیں..........لیکن نیتا جی کو کرنا کیا تھا: وہ تو پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ گرگوں کو بھی معلوم تھا۔ لیکن غصّہ اس بات کا تھا کہ حرام خور نٹ کو ابھی ہی سلپ ہونا تھا۔ لیکن نٹ تو سلپ ہو چکا تھا اور وقت بھی آٹھ سے آگے نکل چکا تھا۔ اسے بھیڑ کے سامنے اپنی بے عزّتی محسوس ہو رہی تھی.......اور پھر اس کے بعد آؤ دیکھا نا تاؤ دوڑ کر جیپ کے پاس پہنچ گئے۔ ڈکّی کھولی۔ گیلن نکالا۔ اور نل کے پاس آکر پٹرول اپنے اُوپر ڈالنے لگے۔ زور زور سے چلانے لگے۔ ''مجھے کوئی روکنے کی کوشش مت کرنا۔ آج مجھے قربانی دینے دو۔'' پھر جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ تیلی جلاتے، چاہتے تھے کہ گُرگے اُسے پکڑ لیں۔ ایسا کرنے میں وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ زور آزمائی کر رہے تھے۔ بار بار نل کی طرف دیکھ بھی رہے تھے۔

پانی والا انکل کا گلا پوری طرح سوکھ چکا تھا۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ سانسوں کی رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پژمردگی کی حالت میں بھی کانوں میں نیتا کی آواز گونج رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ نیتا ڈرامہ کر رہا ہے۔ لیکن کہیں کوئی گُرگا حالات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے چنگاری بن گیا تو پھر اُس کی سالوں کی محنت رائیگاں چلی جائے گی.........یہ خیال آتے ہی اس نے پوری طاقت جمع کر کے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اُٹھ نہیں پایا۔ ''وہ سفید پوش نیتا کو کسی بھی قیمت پر اُدگھاٹن کرنے نہیں دے گا۔'' اس سوچ نے دوبارہ طاقت لگانے پر مجبور کیا۔ چار پائی تھوڑی بہت کسمسائی۔ اس کے بعد اُس نے کچھ اور طاقت لگائی۔ دھیرے دھیرے وہ سہارا لیتا ہوا اُٹھنے میں کامیاب ہوا تو خود کو گھسیٹتے ہوئے دروازے تک پہنچایا۔ نیتا کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ پھر وہ خود کو گھسیٹ کر سڑک تک لایا۔ گھسیٹتے گھسیٹتے نہ جانے اس کے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے صدر چوراہے تک پہنچ گیا۔

بھیڑ حیرت واستجاب میں ڈوب گئی تھی۔ نیتا نے آگے بڑھ کر اُسے روکنے کی

کوشش کی۔لیکن وہ اُنہیں پوری طاقت سے ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔نیتا کے گُرگے اُسے پکڑنے کے لئے دوڑے۔لیکن پکڑنے سے پہلے ہی وہ نلکے تک پہنچ گیا۔ناتواں ٹانگوں میں اس نے پوری طاقت جھونک دی تھی۔نلکے تک پہنچ کر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔لیکن اس کوشش میں وہ بُری طرح سے لڑکھڑایا اور دھڑام سے اوندھے منہ گر پڑا۔

''پانی........ پانی''

حلق سے آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ہچکی پر ہچکی آرہی تھی۔لوگ دوڑے...........

لیکن اس سے پہلے کہ کوئی پانی لے کر آتا۔پانی اپنی مخصوص آواز کے ساتھ نلکے کی ٹونٹی سے گرنے لگا۔لوگوں کی آنکھوں میں بھی پانی اُتر آیا۔چاروں طرف موت کا سنّاٹا چھا گیا۔

پھر بغیر ادگھاٹن کئے نیتا کو وہاں سے لوٹنا پڑا کیوں کہ بھیڑ پانی والا انکل کے جنازے کو نہلانے میں لگ گئی تھی۔

☆☆☆

پوتر استھل کی یاترا

میں پوتر استھل کی یاترا کے لئے نکلا تھا۔

ماں کی دیرینہ خواہش تھی کہ اس سے پہلے اُن کی ارتھی اُٹھے، پوتر استھل کی یاترا کر کے سورگ کا ٹکٹ پکّا کرا لیا جائے۔ لیکن کبھی پتا جی کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوئے کہ وہ تین بہنوں کے تلک اور میری پڑھائی کا خرچ اُٹھانے کے بعد یاترا کی سڑک پر موکچھ کی گاڑی دوڑاتے۔ ہر سال ماں، پتا جی سے کہتی اور ہر سال وہ انگلیوں پر جوڑ گھٹاؤ کرتے ہوئے اگلے سال کا وعدہ کر لیتے۔ جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ لیکن ماں ہر بار پتا جی کی باتوں کو سچ مان کر اگلے سال کا بے صبری سے انتظار کرتی رہتی۔

سال آتا اور نا امید یاترا پر نکل جاتا۔

ہر بار ایسا ہی ہوتا۔

ماں اُمید اور نا اُمید کے بیچ سچ کے بیج بوتی۔ لیکن جب وقت آتا تو پتا جی جھوٹ کی درانتی سے کچھ اس طرح فصل کاٹتے کہ ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل جاتے۔ آخری بار جب ماں کے گڈھے نما رخساروں پر بڑھاپے کے آنسو آ کر ٹھہرے تو پتا جی اندر سے کانپ کر رہ گئے تھے۔

''منّو کے پاپا! اب اور نہیں بچ پاؤں گی۔ رات رات بھر کھانستی ہوں۔ کوئی بڑی بیماری لگ گئی ہے۔ اس بار جیسے بھی کر کے پوتر استھل کی یاترا کروا دو کیوں کہ سورگ کا راستہ تو اُنہیں راستوں سے ہو کر نکلتا ہے۔ اگر یاترا نہیں کر پائی تو بھگوان کے یہاں پکڑی جاؤں

گی۔ مجھے نرک سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

اس بار پتا جی ہمیشہ کی طرح دلاسہ دیتے ہوئے نہ ہی دوسری طرف نکلے تھے اور نہ ہی جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے بہلانے یا ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ مضبوط ارادے کے پاؤں پر سچّے من کو سوار کئے ماں کی طرف بڑھ گئے تھے کہ کہیں سے پیسے کا انتظام نہیں بھی ہوا تو وہ پُروجوں کی آخری نشانی جو دو کمروں کی صورت میں موجود ہے، بیچ کر یاترا کروائیں گے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پہلے اُنہوں نے ماں کے ہونٹوں پر اپنے لرزتے ہاتھوں کو رکھا۔ پھر رخساروں کے گڈھے پر ڈھلک آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

''پگلی کہیں کی۔ایسی باتیں نہیں کرتے۔بھگوان دیکھنا ایک نہ ایک دن تیری منو کامنا ضرور پوری کرے گا۔''

اس لئے پتا جی نے اس بار خوب محنت کی۔ پو پھٹنے سے پہلے گھر سے نکل جاتے اور سورج ڈوبنے کے بعد ہی گھر لوٹتے۔ پاس کی ہی ایک فیکٹری میں مزدوری کا کام کرتے تھے۔اب ہر روز چار پانچ گھنٹہ اوور ٹائم سے پیسے زیادہ مل رہے تھے۔تنخواہ کے پیسے رکھ کر وہ باقی اوور ٹائم کے پیسے ہر ہفتے ماں کو دے دیا کرتے تھے۔

''لو یہ پیسہ تم ہی رکھو۔کہیں خرچہ ورچہ ہو گیا تو پھر پوتر استھل کا پروگرام دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔''

سنیچر کو تنخواہ ملتی۔اس شام وہ ماں کی چارپائی سے آ کر چپک جاتے۔اوور ٹائم نہیں کرتے۔اِس کے بدلے چھٹّی والے دن کام کرتے۔ ماں اکثر اتوار کے دن گھر پر رہنے کے لئے کہتی۔لیکن ضروری کام کا بہانہ بنا کر کے ہمیشہ پتا جی سائکل پر سوار ہو جاتے سات آٹھ مہینے کے بعد ایک ایسی ہی شام تھی۔ پتا جی آنچل میں اوور ٹائم کے پیسے باندھ رہے تھے کہ ماں نے پوچھا۔''اور کتنے ہفتے اوور ٹائم کرنے پڑیں گے۔''پھر ماں نے پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔گرمی کا احساس ہوا تو ماں کے ہاتھ پتا جی کی پیشانی پر جا کر ٹھہر گئے۔اُنہیں بخار تھا۔ماں کے کچھ کہنے سے پہلے وہ بولے۔''تم ہمیشہ مجھے

اتوار کو گھر پر رہنے کے لئے کہتی تھی نا۔ لوکل سے میں گھر پر ہی رہوں گا۔ اب نہ ہی اوور ٹائم کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی چھُٹی کے دن کام کرنے کی۔ کیوں کہ پوتر استھل کی یاترا کے لئے پیسے جمع ہو چکے ہیں۔''

پھر پتا جی نے ماں کی گود میں سر رکھ کر خوب باتیں کیں۔ ماں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے کہا تو وہ مسکرائے۔''بس تھوڑی سی تھکاوٹ ہے۔ میڈیکل اسٹور سے بول کر دوا لے لی ہے۔ سوتے وقت کھا لیں گے۔''

ماں نے دوا کھانے کے لئے کہا تو وہ مذاق میں ٹال گئے۔

اُس شام انہیں بخار کی پرواہ کم خوشی اس بات کی زیادہ تھی کہ پائی پائی کر کے انہوں نے پیسے جمع کر لئے تھے۔ لیکن جب باری آئی تیاری کرنے کی تو بوڑھا جسم جواب دے گیا۔ پوتر استھل کی یاترا پر جانے کے بجائے چار کاندھا یاترا کرنا مناسب سمجھا اور چپکے سے شمشان گھاٹ جانے والے راستے پر منتروں کے درمیان چل پڑے۔

جمع کی ہوئی ساری پونجی ان کی ہی انتم یاترا میں لگ گئی۔

ماں بہُت روئی تھی۔

اور روتی بھی کیوں نہیں: جیون ساتھی انہیں چھوڑ کر اکیلے پرلوک یاترا پر جو نکل گیا تھا۔ برسوں کی تپسیا ساکار ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ لیکن ماں اکثر مجھ سے اس وچھل یاترا کو چھپانے کی کوشش کرتیں۔ پلّو میں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہتیں۔

'' بیٹا! میں نے کبھی تمہارے پتا جی پر یاترا کے لئے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ یہ تو اُن کی بھی دیرینہ خواہش تھی ....لیکن اب جب وہی نہیں رہے اور تم بھی اس لائق نہیں، تو لگتا ہے کہ اب بغیر پوتر استھل کی یاترا کئے ہی مجھے تمہارے پتا جی سے ملنے پرلوک جانا ہو گا۔''

''ماں یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میرے پاس آج نہیں تو کل پیسے ضرور ہوں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی پیسے ہوں گے۔ سب سے پہلے میں آپ کو پوتر استھل کی

یاترا کرواؤں گا۔''

''نہیں بیٹا،تو تو ابھی اپنے باپ کے جتنا بھی نہیں کماتا۔ بیوی اور بچّوں کا خیال رکھ۔ باقی سب بھگوان پر چھوڑ دے۔لیکن میری جگہ بہو کو وہاں کی یاترا ضرور کروانا۔ میں سمجھوں گی کہ تمہارے پتا جی نے مجھے یاترا کروایا ہے۔''

''ماں مجھ پر بھروسہ کرو ماں، ایک نہ ایک دن میں اتنا کمانے لگوں گا ماں۔ ماں میں وچن دیتا ہوں کہ میں سال بھر کے اندر یاترا کے لائق ضرور کما لوں گا ماں.......ماں تم میرے سر ہاتھ رکھ کر آشرواد دو ماں کہ میری کمائی میں برکت ہو ماں۔''

''ماں کا آشرواد تو ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہے بیٹا۔بس تھوڑی سی بھگوان کی کرپا ہو جائے تو میرے تیرے سارے سپنے ساکار ہو جائیں گے۔''

''ہاں ماں کیوں نہیں!''

''ہاں تو اب سُن! میں تبھی یاترا پر جاؤں گی جب تو بہو کو ساتھ لے کر جائے گا۔ میاں بیوی جب ساتھ ساتھ جاتے ہیں تو پُنیہ زیادہ ملتے ہیں۔اور ہاں تو میرے پوتا کو بھی ساتھ لے لینا۔ بالکل وہ تیرے پتا جی پر گیا ہے۔ جب بھی میں اُسے دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ تیرے پتا جی راجو کی صورت میں گھر پر ہی ہیں۔وہ یاترا میں ساتھ ہوگا تو مجھے لگے گا کہ تیرے پتا جی ساتھ ہیں۔''

''ماں میں نے کہا نا کہ آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ یہ سمجھ لو ماں کہ آنے والے سال میں یاترا کا پروگرام پکّا ہو گیا۔''

''جگ جگ جیو بیٹا۔''

ایک طرف ماں جگ جگ جینے کی بات کر رہی تھی۔اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ماں چند سالوں کی مہمان ہے۔اس لئے جیسے بھی کر کے پیسے کا انتظام کروں گا اور ان کے خوابوں کو تعبیر کے دروازے تک پہنچاؤں گا ....دوسری طرف ماں اپنے ساتھ بہو اور پوتے کو لے جانے کے لئے دباؤ بنا رہی تھی۔ کیوں کہ ماں اصلیت سے واقف تھی کہ میری کمائی سے

بہ مشکل گھر چلتا ہے۔ جس مہینے انہیں ایک دو بار کھانسی کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے اس مہینے مجھے کچھ نہ کچھ اُدھار لینا پڑتا تھا۔ اس لئے قصداً انہوں نے اپنے ساتھ بہو اور پوتے کو شریکِ سفر بنالیا تھا کہ نہ میرے پاس کبھی اتنے پیسے ہوں گے اور نہ ہی ہم سب یاترا پر نکلیں گے۔

☆

اس یاترا کے لئے پہلے میں بھی پتا جی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہا۔ لیکن پتنی نے سختی سے منع کر دیا۔ صحت کا واسطہ دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر اس یاترا کو پوری کرنے میں آپ بھی پتا جی کی طرح زندگی سے ہار گئے تو پھر بوڑھی ماں کا کیا ہوگا؟ راجو کا کیا ہوگا؟ جس کا مستقبل آپ کے کاندھے پر ہے..........لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک اچھّی 'بہو' کا فرض بھی نبھانا چاہتی تھی کہ جو وعدہ میں نے اس کی 'ساسوماں' سے کیا ہے، وہ پورا کروں۔

ایک دن ہم دونوں سوچ کی ایک ہی پٹری پر سوار تھے۔

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ دن بہ دن ماں کی صحت گرتی جارہی ہے۔''

''ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے کہ کہیں ماں کو کچھ ہو گیا تو سیدھا بھگوان کا شراپ مجھ پر ہی پڑے گا۔''

''تم پر کیوں........؟''

''اس لئے کہ میں نے ہی آپ کو اوور ٹائم کے لئے روکا ہے.........'' وہ کچھ دیر کے لئے رُکتی ہے۔ گھر کی دیواروں اور فرش کو غور سے دیکھتی ہے اور پھر کہتی ہے۔ ''آپ اس گھر کو کچھ دنوں کے لئے سیٹھ جی کے پاس 'گروی' کیوں نہیں رکھ دیتے۔''

''گروی..........'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ بیوی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے۔ ''تم نے تو میری ساری مشکلیں حل کر دی ہیں۔'' پھر آنسو پوچھتے ہوئے میں نے کہا تھا۔ ''جانتی ہو بھاگیہ وان میں کل رات بھر نہیں سویا اور آج صبح سویرے کام سے پہلے گھر کے کاغذات لے کر سیٹھ کے پاس گیا تھا۔'' میں نے تھیلے سے لنچ باکس

نکالا اور نوٹوں کی گڈّی سامنے رکھ دی۔ ''پورے پچاس ہزار ہیں۔ایک آدمی کے آنے جانے، کھانے پینے اور ہوٹل وغیرہ کے لئے کم سے کم دس ہزار تو لگیں گے ہی۔ا یکسٹرا کچھ ہاتھ میں رہے تو اچھا ہے ....ویسے سلیپر کا اگر ٹکٹ کٹاؤں تو خرچ کچھ کم پڑے گا۔لیکن ماں کے آرام کو دیکھیں تو اے۔سی بہتر رہے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پتنی کے ہاتھوں مضبوطی سے تھام لیا اور یقین دلانے والے انداز میں گویا ہوا۔

''تم دیکھنا، سال بھر کے اندر سیٹھ کے سارے پیسے چکتا کر دوں گا۔''

☆

جس دن پوتر استھل کی یاترا کے لئے گھر سے نکلنا تھا اس دن ماں بے حد خوش تھی ۔تمام رشتہ دار ماں کو بدھائی دینے آئے تھے۔اس لئے بھی کہ اب خاندان میں ان سے زیادہ بزرگ کوئی بچا نہیں تھا۔ماں کو لگ رہا تھا جیسے وہ پوتر استھل کے لئے نہیں بلکہ سیدھے سورگ یاترا کے لئے نکل رہی ہیں۔اس لئے گھر سے نکلتے ہوئے کہا۔

''دیکھ بیٹا! جہاں سے سورگ کا راستہ نکلتا ہے وہ مجھے ضرور دکھانا۔''

''ماں تم بے فکر رہو۔''

''فکر کیسے نہ کروں۔تمہارے بابا سے ملنے اُسی راستے سے تو جانا ہے۔پہلے سے دیکھا بھالا ہوگا تو اچھا رہے گا۔''

پوتر استھل پہنچتے ہی ماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا کہ وہ خواب جو برسوں سے دھارمک آنکھوں پر سجے ہوئے تھے، اُسے آج پاور لگے لینس نے دیکھ لیا تھا...........اس دوران وہ اکثر اپنے پوتے کا ہاتھ پکڑے رکھتی۔ ہر پوجا ارچنا میں ساتھ رکھتی۔میں اور میری پتنی اس کی اُس ادا پر ہنستے بھی کہ اُنہیں پوتے میں پتی کا چہرہ نظر آتا ہے۔جب کہ سچّائی یہ تھی کہ راجو سے زیادہ میرے چہرے میں پتا جی موجود تھے۔

شام ہو چکی تھی۔

پوجا پاٹھ کے بعد سب نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں خریدی۔ بہت کہنے کے بعد

بھی ماں نے اپنے لئے کچھ نہیں لیا۔لیکن راجو کے لئے جو چیزیں اچھّی لگتیں خرید لیتی ۔جس میں کھانے پینے کی چیزیں بھی شامل تھیں ۔ابھی ہم سب اور گھومنا چاہتے تھے۔لیکن ماں کو چلنے میں کچھ تکلیف ہو رہی ہے ۔میں نے پتنی کو اشارہ کیا تو وہ ماں کا ہاتھ پکڑے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی ۔ہم سب مندر سے کوئی دو سو میٹر کی دوری پر بنے دھرم شالہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔جب ماں نے لوٹتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بیٹا! میں نے سورگ کے راستہ کی بات کی تھی ۔وہ کدھر ہے ....؟''

میں نے ڈوبتے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا______''ماں اب تو اندھیرا پھیل چکا ہے۔صبح ناشتہ کے بعد وہاں چلیں گے ۔میں بھولا نہیں ہوں ۔''

''میں بھی وہ راستہ دیکھوں گا پاپا،جس سے ہو کر دادو سورگ گئے ہیں ۔'' راجو نے مچلتے ہوئے کہا۔

''تو تو دادی کا چہیتا ہے ۔تجھے لئے بغیر جا ہی نہیں سکتیں ۔'' پتنی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی ۔

''ارے بہو! تو تو ایسے بول رہی ہے جیسے تجھے چھوڑ کر میں دیکھنے جاؤں گی ۔''

ماں ہولے سے بہو کے کان پکڑ لیتی ہے ۔

☆

سب تھکے ہارے تھے ۔اس لئے دھرم شالہ پہنچتے ہی بیڈ پر گر گئے ۔دادی پوتا ایک پر۔اور دوسرے پر میری پتنی ۔پتنی کے بیڈ پر ہی میں بھی کچھ دیر کے لئے دوسری طرف سر کئے لیٹ گیا۔کچھ دیر کے بعد جیسے ہی کمرے میں نیند کی حکمرانی قائم ہوئی ، میں چپکے سے چائے کی تلاش میں باہر آ گیا۔

موسم کا مزاج بدل رہا تھا۔

تیز ہوائیں چل رہی تھیں ۔

پھر بجلی چمکنے لگی______بارش ہونے لگی ۔

ایسے میں پہاڑی راستوں کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ کب لینڈ سلائیڈ ہو جائے۔ سڑک پہیلی بن جائے۔ عمارتیں ملبے میں دب جائیں۔ نالے جیسا وجود کب ندی کی شکل میں تبدیل ہوکر چٹانوں اور پیڑوں کو اپنا شریکِ سفر بنالے۔ بتانا مشکل ہے۔

میدانی علاقوں میں، میں نے ایسی بارش کبھی نہیں دیکھی تھی ۔اس لئے جلدی جلدی چائے پی کر کمرے میں لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اس جلد بازی میں میں نے اپنی زبان جلا لی تھی۔ کچھ دیر تک میں زبان پر ہونٹ پھیرتا رہا۔ جلن کچھ کم ہوئی تو میں نے دکان دار سے یوں ہی پوچھا تھا۔ ''بھائی صاحب! کیا یہاں کا موسم ایسے ہی بدلتا ہے؟'' دکان دار سمجھ گیا کہ پہاڑی بارش سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔ اس لئے گھن گرج، ہواؤں کے زور اور پیڑوں کے شور سے گھبرا گیا ہوں۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ارے آپ کو اس سے کیا مطلب؟ بس لنگر کھایئے اور دھرم شالہ میں کمبل اوڑھ کر سو جایئے؟''

رات دس بجے کے آس پاس بارش کچھ اور تیز ہوگئی۔ اس وقت میں دھرم شالہ کے سنٹر ہال میں تھا۔ دھرم شالہ کی ریکھ ریکھ کر رہے پنڈت جی اس وقت اپنے یہاں ٹھہرے ہوئے بھکتوں کو پوجا سے سمبندھت پاٹھ پڑھا رہے تھے۔ پوجا سامگری کہاں سے خریدنی ہے بتا رہے تھے کہ میں بیچ میں بول پڑا۔

''پنڈت جی! صبح مجھے اپنی ماں کو سورگ کا راستہ دکھانا ہے۔''

میری طرف دیکھتے ہوئے پہلے مسکرائے پھر بولے__________''بالک! اگر تم نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو ٹھیک چھ بجے صبح نہا دھو کر تیّار رہنا۔ میرے آدمی بُلا لیں گے۔ گھوڑے کا کرایہ کم نہیں کروانا۔ ان دنوں بہت بھیڑ چل رہی ہے۔ میرے یہاں ٹھہرے ہو اس لئے میں نے پہلے ہی پچاس روپئے کم کر دیئے ہیں۔ ایک کے ساڑھے چار سو روپئے لگیں گے۔ آدمی کتنے ہیں.........؟''

ٹھیک اسی وقت جیسے ہی میں نے ''چار'' کہا اتنے زور سے بجلی گرجی کہ میں لرز کر

رہ گیا۔

''یہاں کیا ہمیشہ ایسی ہی بارش ہوتی ہے پنڈت جی؟''

''نہیں!'' کانوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے۔''لیکن ہوسکتا ہے بالک! تمہارے یہاں پدھارنے سے بھگوان پرشن ہوئے ہوں اور اپنے پیارے بھگت کے سواگت میں امرت کی دھارا بہادی ہو.........''مسکراتے ہوئے۔''جاؤ سو جاؤ بالک۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بارش رک جائے گی اور سب کچھ سمان ہو جائے گا۔ پہاڑوں پر جب بھی کوئی آتا ہے تو ایسی پہاڑی بارش کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ کہیں تم ڈر تو نہیں رہے ہو؟''

''بھگوان کے گھر میں بھی کوئی ڈرتا ہے کیا؟'' ہمّت جٹاتے ہوئے میں نے کہا۔

''صرف بھگوان کا گھر نہیں یہاں تو ساکچھات بھگوان رہتے ہیں۔'' پنڈت جی مسکرائے۔

''میری ماں بھی یہی کہتی ہے کہ اُنہوں نے یہاں آ کر ساکچھات بھگوان کو دیکھ لیا ہے۔ اب اُن کا جیون سپھل ہو جائے گا۔''

جب میں کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ ماں میرے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ بیٹا اور پتنی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ پہاڑی بارش کا لطف اُٹھا رہے تھے ______ دھرم شالہ کی ویپر لائٹ میں ندی کی دھارا شور کے ساتھ ایسے کھیل تماشے دکھا رہی تھی جو راجو کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

☆

رات گیارہ بجے کے قریب میں نے ماں کو بلڈ پریشر کی دوا دے کر سلا دیا تھا۔ صبح یہاں سے جلدی چلنا ہے کہہ کر بیوی اور بچّوں کو بھی ساڑھے گیارہ تک بستر پر بھیج دیا۔ وہ دونوں کچھ دیر بات کرتے رہے پھر سو گئے.........رات دو بجے کے قریب بارش کا شور بڑھ گیا۔ دروازہ کھڑکی بند ہونے کے بعد بھی میرے کان پھٹے جا رہے تھے۔ رات میں کئی بار کھڑکی کا پٹ کھول کر ندی میں پڑنے والی ویپر لائٹ کی روشنی میں ندی کی لہروں کو پاگل

ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔خوف میرے اندر سرایت کرنے لگا تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

صبح کی دھندلی روشنی کھڑکی کے شیشے سے اندر داخل ہوگئی تھی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے میں نے دروازہ کھولا۔دیکھا کہ سامنے ہوٹل کی بالکنی میں لڑکے ہیں۔ اور وہ سب اپنے آپ میں انجوائے کر رہے ہیں۔ایک کے ہاتھ میں ویڈیو کیمرہ ہے۔وقت یہی قریب چھ،سوا چھ کا رہا ہوگا۔اچانک ایک تیز آواز کے ساتھ لہریں کچھ اور اوپر اُٹھیں تو ویڈیو والے لڑکے نے چلتی پھرتی تصویریں اُتارنی شروع کر دیں۔میں ان لہروں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔جب کہ ویڈیو شوٹ کرنے والے ندی سے بالکل قریب تھے۔ہمارا دھرم شالہ پھر بھی اس ہوٹل سے ۵۰/میٹر کی دوری پر تھا۔

لیکن اس کے باوجود پہاڑی بارش کا زور اور ندی کے اُبھان کو دیکھ کر ڈر میرے اندر گہرا ہوتا چلا گیا۔میں فوراً اندر بھاگا کہ سب کو جگا دوں۔میں نے جیسے ہی ماں کو جگانے کے لئے ہاتھ بڑھایا،ایسا لگا جیسے سامنے کے پہاڑ چلنے لگے ہوں۔میں گھبرا کر باہر آیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے جس ہوٹل کی بالکنی سے ویڈیو شوٹ کر رہے تھے وہ ایک طرف آہستہ آہستہ جھکنے لگا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک زوردار آواز کے ساتھ وہ سب ندی کا حصّہ بن گئے۔میں دوڑ کر اندر گیا۔دیکھا کہ سبھی کی آنکھیں اس تیز آواز کی وجہ سے کھل گئی تھیں۔اور کیا ہوا؟ جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے ماں کو کاندھے پر اُٹھایا اور بس اتنا کہا۔''بھاگو یہاں سے..........''

☆

پہاڑی گھاٹیوں میں دونوں طرف سے پھنس جانے کے باعث آپسی ٹکراؤ کے نتیجے میں بادل پھٹا تھا۔اور ساتھ ہی ساتھ پہاڑوں کے اوپر برفیلی جھیل پر مسلسل بارش نے برف کو پگھلنے پر مجبور کیا تھا۔اوپر سے بادل پھٹا اور ایک ساتھ بہت سارا پانی جھیل کے ایک بہت بڑے حصّے کو توڑتا ہوا قریب تین چار سو میٹر کی اونچائی سے چالس پچاس کیلومیٹر کی رفتار

کے ساتھ ڈھیروں ملبے اور بڑے بڑے چٹانوں کو بہاتا ہوا دل دہلا دینے والے شور و ہنگامے کے ساتھ گھاٹیوں سے آگے بڑھا اور پوترا استھل تک جا پہنچا۔ پانچ سے دس منٹ کے اندر پورے علاقے کو اپنی چپیٹ میں لے کر ہزاروں کو موت کے گھاٹ اُتارتا ہوا دیکھتے ہی دیکھتے نامعلوم منزل کی اور بہا لے گیا۔

میں بہہ جاتا اگر ماں میرے ساتھ نہیں ہوتی۔

ماں میرے ساتھ تھی اس لئے میں بہتے بہتے بچ گیا۔ ورنہ میں زندہ کہاں رہ پاتا۔ یہ میرے اوپر ماں کی خاص کرپا تھی کہ میں اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی آج زندہ ہوں۔ اس وقت ایک پل کے لئے پاؤں کی زمین سرک گئی تھی اور پانی نے اپنا تانڈو دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ابھی قریب پچاس میٹر میں بہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں دور نکل جاتا، پانی نگل لیتا، مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔

''منّو!''

اور میں ماں کی آواز پر پیچھے کی طرف پوری طاقت سے پلٹنا چاہا تو اس کوشش میں بہاؤ کا زاویہ بدل گیا اور میری خوش قسمتی دیکھئے کہ ایک چٹّان سے جا ٹکرایا۔ میں جان بچانے کی خاطر چٹان پر چڑھ جانا چاہتا تھا کہ تبھی میری بیوی کی آواز آئی۔

''ہائے راجو''۔

میں نے پیچھے کی طرف گردن گھُمائی۔ دیکھا جگر کا ٹکرا میری طرف بہا چلا آ رہا ہے۔ میں نے کسی طرح چٹّان کا سہارا لیا اور پاؤں کو جمائے رکھنے کی کوشش کی تا کہ اُسے پکڑ سکوں۔ اس کوشش میں کئی بار لگا کہ میں بھی بہہ جاؤں گا۔ لیکن آنکھوں کے سامنے جب اولاد بہہ رہی ہو تو پھر کون ہے جو جان کو جوکھم میں نہیں ڈالے گا۔ پھر میں ہمّت کے ہاتھوں اُسے پکڑنے اور اپنی طرف کھینچ پانے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد میں جلد سے جلد اُسے لے کر چٹّان پر چڑھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں چٹّان پر چڑھتا، ایک بار پھر کچھ ویسی ہی دل دہلا دینے والی آواز آئی۔

''راجو کے پاپا۔''

یہ آواز اتنی جانی پہچانی تھی کہ میں بیٹے کو لے کر چٹان پر چڑھتے چڑھتے پیچھے مڑ گیا۔ راجو میرے ہاتھ سے سلپ ہونے لگا تھا، اس وقت میری دھرم پتنی بہتی ہوئی میرے پاس سے گذرنے لگی تھی۔ میں نے راجو کو ایک ہاتھ سے سنبھالا اور پھر اسی طرح سے پاؤں کو چٹان کے اسی حصّے میں ٹکا کر اُسے بچانا چاہا۔ اس کوشش میں کبھی راجو کا ہاتھ چھوٹ جاتا تو کبھی لگتا کہ دھرم پتنی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس سے پہلے کہ پانی کا بہاؤ دھرم پتنی کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا اور ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل کر دیتا، میں نے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ چٹان کے سہارے خود کو ٹکائے بھی رکھا اور دوسرے ہاتھ سے دھرم پتنی کا آنچل پکڑنے کی تگ ودو میں بھی لگا رہا۔ آخر کار کامیابی مل ہی گئی۔ کچھ دیر تک ایک ہاتھ سے راجو کو اور دوسرے ہاتھ سے دھرم پتنی کو اُسی طرح پکڑے رکھا۔ اس وقت یہ سوچ ہی رہا تھا کہ راجو کو چٹان پر چڑھا کر دھرم پتنی کو بھی چڑھا دے گا۔ تبھی ایسا لگا کہ کوئی جانی پہچانی آواز کانوں سے ٹکرائی ہے ....لیکن حقیقت اس بات سے آشنا تھی کہ کوئی آواز سماعت سے ٹکرائی ہی نہیں ہے۔ تو کیا صرف یہ میرا وہم تھا۔ پھر ایسا کیوں لگ رہا تھا ....کہ کوئی آواز ....لیکن اس کے باوجود لہروں کے بے ہنگم شور نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا اور مجبور کیا کہ پیچھے مڑوں۔ دل بھی یہی کہہ رہا تھا۔

''تمہیں کوئی آواز دے رہا ہے۔''

راجو کو چٹان پر چڑھاتے چڑھاتے میں جیسے ہی پیچھے مڑا، میری آتما جسم کے حصار سے باہر نکل گئی۔ سفید ساڑی میں ماں بہتی ہوئی آرہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں راجو تھا اور دوسرے ہاتھ میں دھرم پتنی اور بھگوان کی کرپا چٹّان بن کر مجھے سنبھال رکھی تھی۔ لیکن دھڑکتا دل یہ کہہ رہا تھا کہ اگر پانی کا بہاؤ کچھ اور بڑھا تو وہ کسی بھی قیمت پر بیٹا کو اور نہ ہی دھرم پتنی کو چٹان پر چڑھا پائے گا۔ اس لئے میں جلد سے جلد دونوں کو چٹان پر چڑھا دینا چاہتا تھا۔

لیکن ایسے میں ایک مصیبت اور کھڑی ہوگئی۔ ماں بہتے ہوئے بالکل سامنے آچکی تھی۔ اگر ماں کو پکڑنے کی کوشش کروں تو ایک ہاتھ چھوڑنا پڑے گا۔ بیٹے کو یا پتنی کو۔ فیصلہ کرنا میرے لئے مشکل ہورہا تھا۔ ایک طرف جگر کا ٹکڑا تھا تو دوسری طرف میری محبّت۔ لیکن یہ وقت فکر وعمل سے گذرنے کا نہیں تھا۔ سکنڈ کے سویں حصے میں اپنے ذہن کو فیصلہ سُنانا تھا کہ کس کو چھوڑوں اور کسے پکڑوں۔ آخر کار میں نے ایک ہاتھ چھوڑنے میں ہی عافیت سمجھا۔ لیکن نہ جانے اتنا حوصلہ بیوی میں کیسے آگیا کہ اس نے جیسے تیسے کر کے بالوں سے راجو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے اس بات کی بھی پرواہ نہیں کی کہ ایسا کرنے میں ذرا سا بھی توازن بگڑا تو وہ لہروں کی نذر ہو جائے گی۔ اور اسی پل میں نے اپنی طاقت مجتمع کر کے ماں کو کھینچ لیا تھا۔ ماں کو پکڑتے وقت بیوی چھوٹ رہی تھی۔ مطلب راجو بھی ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ ویسے دل پر پتھّر رکھ کر میں نے پہلے ہی راجو کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ماں کی ممتا تھی کہ اس نے جان کی پرواہ نہیں کی اور اب وہ ایک ہاتھ سے اُسے پکڑے ہوئے تھی۔ دھرم پتنی کے بچھڑنے کا مطلب، اس کے ساتھ راجو کا بھی پانی میں ولین ہو جانا تھا۔ مصیبت کی اس گھڑی میں جب خود کو بچا پانا مشکل تھا میں کبھی دونوں کو اور کبھی تینوں کو سنبھالنے کے لئے لہروں سے جوجھتا رہا تھا۔ کبھی ایک چھوٹتا تو کبھی دوسرا۔ سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ لیکن یہ تو طے تھا کہ چٹان پر کسی ایک کو ہی میں چڑھا سکتا تھا۔ کیوں کہ جس کسی کو بھی چڑھاتا اس کے لئے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا لینا تھا۔ اس کشمکش میں پانی کا بہاؤ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور اب یہ لگنے لگا تھا کہ اگر ذرا بھی دیر کی تو پانی کا ریلا ہم سب کو بہا کر انجان راہوں کی طرف لے جائے گا۔

قیامت کا سماں تھا۔ بیوی کی آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی۔ بیٹا کے چہرے پر موت سایہ فگن تھی۔ اور میں ماں کو بچانے کے لئے پریشان۔ لیکن ماں میری اس ادا پر پُر سکون نظر آرہی تھی۔ اُسے اپنے بارے میں شاید اطمینان تھا کہ بیٹا اسے بچالے گا۔ لیکن دھرم پتنی کے دل میں کچھ اور چل رہا تھا۔ پہلے اسے لگا کہ میں راجو اور اس کی خاطر ماں کو چھوڑ

دوں گا۔ایسے میں اس کا سوچنا بھی واجب تھا۔لیکن جب اس نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں کی گرفت ماں پر مضبوط پڑتی جارہی ہے اور میں ہر لمحہ اسے اپنے سینے سے قریب کرتا جارہا ہوں تو اسے جھٹکا لگا۔آخر کار اس سے رہا نہیں گیا۔ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''راجو کے پاپا..........جلدی کرو......... پانی بڑھ رہا ہے........''

''نہیں.........میں ماں کا ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''پاپا!.........میں ....ڈوب رہا ہوں.........پلیز.........مجھے بچالو.........''

''میں کہتی ہوں.........جلدی ہاتھ چھوڑو........نہیں تو راجو........''

''نہیں.........میں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''پاگل مت بنو۔ماں کو پانی میں بہنے دو۔''

''نہیں.........میں ایسا بھی نہیں کر سکتا۔''

پانی کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

راجو چلایا۔

''پا..........پا..........''

بیوی چیخی ۔

''جلدی........چھو.........ڑو..........و.........ر........نہ........''

اسی وقت پانی کا ایک زور دار ریلا آیا۔میں کانپ کر رہ گیا تھا۔میں بھی ڈوب جاتا۔لیکن مجھے ڈوبنا نہیں تھا۔اس وقت تک زندہ رہنا تھا جب تک پوتر استھل کی یاترا اپنے انتم چرن کو نہیں پہنچ جاتی ۔اس لئے میں نے ایک ہاتھ چھوڑ دیا۔چھوڑتے ہی گاؤں کا شمشان گھاٹ یکا یک آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

'اگنی' ماں کے انتم سنسکار کی 'ساکشی' بن رہی تھی اور اُس کی 'لو' میں میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

☆☆☆

خواہشات کی اندھی گلی

خواہشات کی سڑک پر چلتے چلتے وہ ایک دن اندھی گلی تک پہنچ گئی۔

مرد چاہے جس قماش کے ہوں، اُن کی آنکھیں ہمیشہ لڑکیوں کا پیچھا کرتی ہیں۔لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس کا مرد ایسا ہو جو کبھی کسی کے پیچھے نہ بھاگے۔اس لئے اس گلی سے گذرتے ہوئے اکثر وہ اپنے ہی قدموں کی چاپ سے ڈر جاتی تھی۔اُسے لگتا جیسے کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔اس کے قدم تیز تیز چلنے لگتے تھے۔دل دھڑکنے لگتا تھا۔لڑکھڑاتی، گرتی، سنبھلتی وہ اسی طرح آگے بڑھتی رہتی۔

نام تھا گل بدن۔

وہ اپنے نام کی تشریح تھی۔سیانی سیڑھی چڑھتے ہی اُسے احساس ہو گیا تھا کہ گُل کا تعاقب جوان کیا بچے اور بوڑھے بھی کرنے لگے ہیں۔اس لئے اُس کے حسن کی سرسبز شاخوں پر غرور کی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔جس سے نکلنے والا مُشک مساموں کے راستے داخل ہوکر اندر ہی اندر اُسے عطر بیز کرنے لگا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی خوبصورتی کسی ایرے غیرے کو نہیں سونپے گی۔

لیکن دل کی عدالت نے جب فیصلہ سنایا تو سب حیران رہ گئے۔

گھر کے افراد اور دوست واحباب نے سمجھانے کی کوشش کی۔لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی۔گھر بار چھوڑا اور ہمیشہ کے لئے روشن کے گھر چلی گئی۔

شادی سے قبل وہ عجیب کشمکش میں تھی۔پانچ سال تک فیصلے کی سڑک پر کبھی آہستہ

اور کبھی تیز تیز چلتی رہی اور سوچتی رہی کہ زندگی کے اس اہم فیصلے میں وہ غلطی تو نہیں کر رہی ہے۔لیکن ہر بار اُس نے خود کو درست ٹھہرایا کہ دنیا کا کوئی مرد ایسا نہیں جو لڑکیوں پر نظر نہ ڈالتا ہو۔ بیوی ہوتے ہوئے بھی کسی کے بارے میں نہ سوچتا ہو۔لیکن روشن اُن مردوں میں نہیں جو اِدھر اُدھر منہ مارتا پھرے۔

وہ اندھا تھا۔

ماں باپ نے نام روشن رکھا اور اس نے بھی لٹل ماسٹر کمپٹیشن میں اپنی آواز کا جوہر دکھا کر اپنے ماں باپ کا نام روشن کیا۔اس وقت گل بدن چودہ کی تھی۔اُس نے اُسے ٹی وی پر گاتے ہوئے دیکھا تھا۔ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے وہ روشن کی دیوانی ہوگئی اور اُس کے گائے گانے گنگنانے لگی۔اُن کے والد کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ بیٹی گانا گائے۔لیکن گائیکی کی شُد بُد رکھنے والی پڑوسن نے جب اس کی والدہ سے یہ کہا کہ اگر آپ کی بیٹی ریاض کرے گی تو ایک نہ ایک دن وہ بھی روشن کی طرح محلے کا نام روشن کرے گی۔

والدہ کے ذہن کے اسکرین پر فوراً روشن کا چہرہ روشن ہوا۔اُنہوں نے پہلے شوہر کو منایا کہ ''بچّی کا شوق ہے۔پورا کر لینے دیجئے۔نقاب میں آیا جایا کرے گی۔کون سا اُس سے پیسے کمانے ہیں۔اللہ نے بہت دیا ہے۔'' وہ مان گئے۔پھر گل بدن، روشن کے گھر جا کر سنگیت کے گُر سیکھنے لگی۔جب سے گُل بدن اُس کے پاس آنے لگی تھی تب سے وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگا تھا۔آواز میں ایک کشش تھی جس نے روشن کو مسحور کر رکھا تھا۔وہ ہمیشہ اُس کے آنے کا انتظار کرتا اور جب وہ چلی جاتی تو اُس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔ابتدائی ایک دو مہینے بس یوں ہی کٹے۔لیکن پھر سُر تان سے لے کر سیاہ چشمہ، بیٹھنے کا اسٹائل اور ہارمونیم بجانے کا انداز گل بدن کو اتنا اچھا لگا کہ جب بھی ریاض کے لئے دوزانو بیٹھتی، دل کے تار پر اُس کی مخروطی انگلیاں خود بخود تیزی سے چلنے لگتیں۔

دھیرے دھیرے ریاض کم ہونے لگیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ۔روشن کو اس کی باتیں بہت پیاری لگتیں۔جب وہ پاس ہوتی اُسے لگتا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے

روشنی کا ایک گھیرا ہے۔گل بدن سوچتی کہ ساری زندگی روشن اپنی آنکھوں کے اس اندھیرے کے ساتھ کیسے رہ پائے گا؟ کسی نہ کسی کو تو روشنی بن کے آگے آنا ہوگا۔تو کیا وہ اُس کی زندگی کی روشنی نہیں بن سکتی؟ خواہشات کی اندھی گلی سے گذرتے ہوئے وہ یہ سب کچھ سوچتی۔ ''کیوں نہیں!''اس کی نظر میں روشن دنیا کے تمام مردوں میں ارفع واعلیٰ تھا۔کیوں کہ جب بھی وہ گھر سے نکلتی تھی تو مردوں کی آنکھیں اُس کے وجود سے چپک جاتی تھیں۔ جہاں جہاں جاتی اُس کا پیچھا کرتیں۔ اُس نے راہ چلتے ٹین ایج لڑکوں سے لے کر سفید پوش بوڑھوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کی پریوں کے پہلو میں سر رکھ کر سونے والے مردوں کو بھی قریب سے دیکھا تھا جن کی آنکھوں کی انّی دوپٹہ، جمپر اور نہ جانے کس کس چیز کو چھید کر کے پیوست ہونے کے لئے بے تاب رہتی۔ بھیڑ سے گذرتے ہوئے وہ اکثر ڈر جایا کرتی۔اُسے لگتا کہ سیاہ، بھوری، بھینگی اور گولڈن فریم میں سجنے والی ساری چھوٹی بڑی گھورتی ہوئی آنکھیں اپنی پسندیدہ جگہ کے کپڑے تار تار کر رہی ہیں۔اور پھر ایک وقت ایسا لگتا جیسے جسم کے سارے کپڑے چندی چندی ہو کر جسم سے الگ ہو گئے ہیں اور وہ برہنہ لوگوں کے سامنے سے گذر رہی ہے اور آنکھوں کی ہزاروں انّی اس کے اندر دھنستی ہی چلی جارہی ہے۔

چار پانچ سال کا لمبا سفر۔اس سفر میں جب بھی وہ روشن کے ساتھ ہوتی۔تحفظ کا احساس اس کے اندر ہمیشہ جاگزیں رہتا۔اُسے لگتا کہ یہی وہ 'مرد' ہے جس کے سائے میں 'ازدواجی زندگی' پوری طرح سے محفوظ رہ سکتی ہے۔اس نے پڑوسیوں کے مردوں کو اور سہیلیوں کے عاشقوں کو قریب سے دیکھا تھا جو ہمیشہ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر لار ٹپکاتے رہتے تھے۔دو چار نے تو اُسے پرپوز بھی کیا تھا کہ اُس کی خاطر وہ بیوی کو 'طلاق' دے سکتا ہے۔ایک نے تو سہیلی کو ٹھکانے لگانے کی بات تک کہہ دی تھی۔پھر وہ سیریلس اور فلموں میں بھی وحشی آنکھوں اور ان کے پیچھے چھپے ارادوں کو دیکھ چکی تھی۔مردوں کے وجود سے اُسے انکار نہیں تھا۔لیکن آہستہ آہستہ ان کی وحشیانہ آنکھوں سے اُسے وحشت سی ہونے لگی تھی........اور یہ وحشت ایک دن اتنی بڑھ گئی کہ اس نے تاریکی کو ہی روشنی سمجھ لیا۔جب کہ

روشن بھی اندر ہی اندر سے بے حد چاہتا تھا
۔اظہار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔وہ جانتا تھا کہ اس کا اور گل بدن کا کوئی میل نہیں ہے۔
آنکھوں کی اندھیاری گلی کے کسی کونے میں بیٹھ کر وہ اس کا لمس تو حاصل کر سکتا ہے۔لیکن
پانے کی تمنّا نہیں۔ایک دن گُل بدن نے جب اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس کی
آنکھوں کا اندھیرا اور بھی گہرا گیا تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو گل بدن؟ پاگل تو نہیں ہو گئی.........؟''

''ہاں روشن! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی تم سے ہی کروں گی۔لوگ مجھے
پاگل سمجھیں تو سمجھیں؟''

''تم خوبصورت ہو۔تمہاری شادی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔میں تو نابینا ہوں
گُل بدن۔''

''تم نابینا نہیں ہو۔میری آنکھوں سے دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ میں نے
لاکھوں کروڑوں مردوں میں تمہیں ہی کیوں پسند کیا؟''

''ایک بار پھر سوچ لو۔اپنی زندگی کو نرک کے اندھیرے میں مت ڈھکیلو۔میں
تمہارے لائق نہیں ہوں۔''

لیکن گل بدن ایک نہیں مانی اور اپنی خواہشات کی سڑک پر چلتے ہوئے گھر والوں
کی بغاوت کے باوجود روشن کے گھر چلی آئی۔

وہ بے حد خوش تھی۔تمام سہیلیوں میں صرف اس کے پاس ایسی آنکھیں تھیں جو
ہمیشہ سیاہ چشمے کے اندر چھپی رہتی تھیں۔رات کے بستر پر جب وہ اس کے ساتھ ہوتی تو
چشمہ سرہانے ہوتا۔اُسے سیاہ چشمے کے اندر سے خالی خالی آنکھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔وہ
جب مدہوشی کے عالم میں ہوتی تو باربار ان آنکھوں کو چوما کرتی۔آنکھوں کے کنارے جمے
ہوئے سفید لجلجا سا مادّہ اس کے ہونٹوں سے چپک جاتا۔پہلے اُسے کراہیت سی ہوتی۔پھر وہ
مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر اِس طرح مل دیتی جیسے کوئی قیمتی کریم ہو۔ایک پل بھی خود سے

الگ نہیں کرتی ۔اپنے ہاتھوں سے نہلاتی ۔مخملی تولیے سے جسم پوچھتی ۔آنکھوں کو صاف کرتی ۔فیشن ایبل کپڑے پہناتی ۔اس کے ذائقے کا خیال رکھتی ۔سامنے بیٹھ کر کھانا کھلاتی ۔اس کی ہر پسند ناپسند کے بارے میں سوچتی ۔جہاں جاتی ساتھ لے جاتی ۔سہیلیوں سے فخر سے ملواتی ۔اُس وقت اُس کی آنکھوں کی پتلیوں میں ناچتے ہوئے خوشی کے پاؤں صاف دیکھے جاتے ۔جیسے اُس نے کوئی کارہائے نمایاں انجام دیا ہو۔

انسان کی خواہشات لامحدود ہیں۔

ایک پوری ہوئی نہیں کہ دوسری جنم لے لیتی ہے۔

خواہشات کی ایسی ہی اندھی گلی سے وہ ایک بار پھر گذر رہی تھی..........

لاشعور میں بسی دوسری خواہش نے اُسے بے چین کرنا شروع کر دیا تھا۔اُسے لگا کہ اُس کی اس خواہش کی اگر تکمیل نہیں ہو پائی تو اُس کے خوبصورت وجود کا خاتمہ ہو جائے گا۔شروع شروع میں اس نئی خواہش کے انکُر پھوٹتے ہی اس نے جڑ میں حیا کا تیزاب ڈال دینا چاہا۔لیکن وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکی۔

ایک ماہ ابھی مکمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ دوسری خواہش ضد کے ہاتھ پکڑے سامنے کھڑی ہو گئی کہ سہیلیوں کے مردوں کی طرح روشن بھی اس کا انگ انگ دیکھے اور تعریف کرے۔لیکن سوال اپنی جگہ قائم تھا کہ کیسے دیکھے.......؟ وہ تو اندھا ہے۔یعنی اُس کی خوبصورتی کال کوٹھری میں ہی سڑ جائے گی........؟نہیں نہیں! پیسے جو لگ جائیں۔گھر بار بیچنا کیوں نہ پڑے۔لیکن وہ اُس کا علاج کسی اچھّے ڈاکٹر سے کروائے گی ۔آنکھیں واپس لائے گی۔

اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اس نے سب سے پہلے نیٹ سے آئی ٹرانسپلانٹ کے متعلق معلومات جمع کیں اور پھر نامی ہسپتال میں اس کا علاج کروایا۔آپریشن کامیاب ہونے کے ففٹی پرسینٹ چانسیز تھے۔لیکن آپریشن کے بعد ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی۔''آپریشن سکسیس فُل رہا ہے۔باقی اُوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔'' گل بدن یہ سن کر

خوشیوں سے خود کو نہارنے لگی تھی کہ اب اس کی خواہش کے بھی پر لگیں گے۔

آپریشن ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ابھی ایک ہفتہ اوراپنی نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے۔لیکن گل بدن کے مطابق جب آپریشن سکسیس فُل ہے اور دوا جتنی چلنی تھی وہ چل چکی ہے ۔صرف ایک ہفتے تک پٹّی بدلنی ہے اور دوا ڈالنی ہے۔ یہ کام تو وہ گھر پر بھی بخوبی کرسکتی ہوں۔اس لئے اس نے ڈاکٹر پر دباؤ بنانا شروع کیا۔

ڈاکٹر چُھٹی دینا نہیں چاہتے تھے کہ یہ کوئی نارمل کیس نہیں ہے۔ بے احتیاطی روشنی چھین سکتی ہے ۔لیکن گل بدن کو نہ جانے کس چیز کی جلدی تھی ۔اس نے ایک نہ سنی۔ اپنے رِسک پر چُھٹی لے کر گھر آ گئی۔ اُس روز وہ بہت خوش تھی کہ اب وہ آنکھیں وجود میں آ گئی ہیں جس کے روبرووہ اپنی ان دیکھی خوبصورتی کا جھما کا کر سکے گی۔

گھر لوٹتے وقت راستے کے ایک مال سے کام دار پنک ساڑی خریدی۔ گھر پہنچ کر سوچا کہ پہلے ساڑی پہن کر دیکھیں ۔پھر سوچا نہیں، روشن کی آنکھوں میں دوا ڈالے اور پٹّی بدل کر اُسے آرام کرنے دے۔ بس ایک ہی ہفتے کی تو بات ہے ۔سوچ کا ریشم دماغ میں ملسل اُلجھتا جار ہا تھا کہ ڈاکٹر نے بھی یہ کیا ایک ہفتہ کا وقت دے دیا؟ اگر میں ڈاکٹر ہوتی تو ایسی دوا دیتی کہ اِدھر آپریشن ہوا اور اُدھر چھُٹّی ۔نہ آرام نہ انتظار۔ انتظار بھی ایک ہفتہ کا ۔ایک ہفتہ کا مطلب سات دن .... یہ ایک ہفتہ ایک دن کا بھی تو ہوسکتا تھا۔ سات دنوں کے بدلے سات گھنٹے کا نام بھی 'ہفتہ' رکھا جا سکتا تھا۔لیکن اب تو اسے ۲۴x۷ گھنٹے کا ایک لمبا انتظار کرنا ہوگا۔اورانتظار ہمیشہ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔

سوچ کا ریشم اُلجھتا ہی جار ہا تھا۔

اندر ایک عجیب کشمکش جاری تھا۔ وہ پسینے میں بھیگنے لگی تھی۔ اس نے پہلے روشن کو بیڈ پر لٹایا۔ پھر خود صوفے پر بیٹھ گئی ۔ درمیان سنٹر ٹیبل تھا۔ جس پر رکھی پنک ساڑی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ بیڈ کے ٹھیک اوپر پنڈولم والی گھڑی تھی ۔اُس وقت اُس کی آنکھیں پنڈولم کے ساتھ ساتھ ڈول رہی تھیں ۔کبھی وہ ساڑی کو دیکھتی تو کبھی روشن کی آنکھوں کو۔کبھی

گھڑی کی ٹک ٹک سننے لگتی۔ سوچنے لگتی۔ سوچتی ہی چلی جاتی۔

ایک ٹِک ٹِک = ایک سکنڈ

۶۰ سکنڈس کا ایک منٹ

۶۰ منٹس = ۳۶۰۰ سکنڈس

ایک دن میں ۲۴ گھنٹے ______ یعنی ۳۶۰۰x۲۴ = ۸۶۴۰۰ رسکنڈس

اس طرح ۷ دن میں ۶۰۴۸۰۰ رسکنڈس

اس کا مطلب کہ یہ پنڈولم ۶۰۴۸۰۰ مرتبہ ڈولے گا اور مجھے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اتنا لمبا انتظار کرنا پڑے گا۔

حساب کتاب مکمل ہونے کے بعد وہ ماہر ریاض داں کی طرح مسکرائی۔ پنڈولم کو ایک بار پھر دیکھی۔ اپنے اُلجھے ہوئے سنہری بالوں کو سمیٹا، اور اپنے آپ میں گم ہوگئی، تبھی اُسے لگا کہ پنک ساڑی ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑنا چاہ رہی ہے۔ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ کچھ دیر اُس کی شوخ اداؤں کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے کام دار آنچل کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے مسکرائی۔

''پنکی ڈارلنگ! میرا بس چلے تو میں ابھی تمہیں پہن کر روشن کے سامنے کھڑی ہو جاؤں۔ لیکن کیا کروں ڈاکٹر نے ایک ہفتے کا انتظار جو لکھ دیا ہے۔ اب ایسے میں تم بھی میرے ساتھ انتظار کرو۔ ہو سکے تو ساتھ ساتھ پنڈولم کی گنتی بھی کرتے جاؤ۔ جیسے ہی وہ چھ لاکھ چار ہزار آٹھ سو بار ٹِک ٹِک کے جھولے جھول لے گا۔ سمجھو تمہاری قسمت سنور نے کا وقت آ گیا۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لئے کہ اُس وقت کوئی میری اَن دیکھی خوبصورتی کو دیکھ رہا ہوگا۔ معلوم ہے پنکی! وہ خوش قسمت مجھے دیکھنے سے پہلے تمہیں دیکھے گا اور سوچے گا کہ جس چیز پر اتنی قیمتی ساڑی جھل مل کر رہی ہے اس کے اندر کی خوبصورتی کیسی ہوگی ....؟ وہ تو بے چین ہو جائے گا اور چاہے گا کہ تمہیں آنچل سے دامن تک اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لے۔ اس وقت میرے جسم کا ایک ایک انگ اپنی خوبصورتی عیاں کرنے کے لئے مچل رہا ہو

گا۔ اور وہ آنکھیں..........جس نے کبھی دنیا دیکھی ہی نہیں اچانک بے حد خوبصورت لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر کس کس طرح مچلے گا؟ کتنی دیر تک اور کہاں کہاں گھورتا رہے گا؟ یہ سوچ کر میں ابھی سے کتنی اکسائٹیڈ ہوں۔ یہ تم نہیں جان سکتی.........لیکن ڈرتی ہوں کہ پتہ نہیں یہ پنڈولم اُس وقت تک ہمارا ساتھ دے گا کہ نہیں۔ دھیرے دھیرے تو نہیں ڈولنے لگے گا۔ اگر پنڈولم نے ایسا ویسا کچھ کیا تو گھڑی سے نکال کر اتنا تیز آگے پیچھے ڈلاؤں گی کہ دم نکل جائے گا۔ پھر سمجھ میں آئے گا اُسے کہ میں بھی انتظار کروانے والوں کے لئے کس طرح کا بَلا ہوں۔ لیکن کیا کروں؟ اپنی خوشی کی خاطر یہ انتظار تو کرنا ہی ہے۔

پہلا دن ______ انتظار کا عمل ابتدائی حمل سے گذرا۔

دوسرا دن ______ پنڈولم اور ساڑی سے گھنٹوں گفتگو کرتی رہی۔

تیسرا دن ______ حسن کی بے خیالی میں پٹّی بدلنا اور آنکھوں میں دوا ڈالنا بھول گئی۔

چوتھا دن ______ بھول سدھارنے کی خاطر تیسرے دن کی دوا کمپن سیشن کے طور پر اس کی آنکھوں میں ڈال دی۔

پانچواں دن ______ پاگل پن کا دورہ پڑا اور اس نے پٹّی کئی بار بدلی۔

چھٹّا دن ______ سوجی آنکھیں اور پنڈولم ساتھ ساتھ جھولتی رہیں۔

ساتوں دن ______ رات بھی وہ سوئی نہیں۔ کبھی گھڑی کو تو کبھی روشن کی آنکھوں کو دیکھتی اور کبھی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر الگ الگ زاویے سے اپنے جسم کے نشیب و فراز کو نہارتی۔ خود پر فریفتہ ہوتی۔ اور اپنے آپ میں بڑبڑانے لگتی کہ نقاب کشائی کا وقت آ گیا ہے۔ جلوہ بکھرنے والا ہے۔ آنکھیں قصیدہ بن جائیں گی۔ ہونٹ نغمہ ریز ہو جائیں گے۔ وہ خوشی سے جھومنے لگے گی۔ پاگل ہو جائے گی اپنی تعریف سُن کر۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ خوشی سے جھومتے پاؤں اچانک ٹھہر سے گئے۔ آنکھیں پنڈولم پر ٹکی ہوئی تھیں اور گنتی پوری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مدِ نظر گُل بدن نے ساری

فارملیٹیز پہلے ہی پوری کر رکھی تھی تا کہ جیسے ہی انتظار ختم ہو، وہ خواہشات کی سڑک پر حُسن کی تکمیل کے لئے نکل پڑے ______ پھر کچھ سوچ کر ہڑبڑاتے ہوئے صوفے سے اُٹھی۔ گرتے گرتے بچی۔ سنٹر ٹیبل سے ساڑی اٹھائی اور سیدھے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ جلدی جلدی پہنی۔ تھوڑا میک اَپ کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں دستانہ پہن کر بیڈ کے پاس آ گئی۔ روشن کی پیشانی چومی۔ ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر تک بندھی پٹّی پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ خدا سے دعائیں مانگنے لگیں.........چند ثانیے بعد آہستے سے آنکھیں کھولیں، مسکرائی اور پھر ہولے ہولے آنکھوں سے پٹّی ہٹانے لگی۔ دو تین بار واش کیا اور پھر روئیں دار سافٹ کپڑے سے آنکھوں کو صاف کر کے اُسے دھیرے سے بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر اس کے بغل میں وہ بھی لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔ پانچ منٹ تک یہی عمل جاری رہا۔ پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ہونٹ، کان کے پاس لے جا کر دانت کاٹتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''روشن ڈارلنگ! آنکھیں کھولو۔''

روشن کے چہرے کے تناؤ سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوشش کر رہا ہے لیکن پلکیں ہیں کہ پوری طرح سے کھل نہیں رہی ہیں۔

''روشن کوشش کرو۔'' تھوڑی سی پلکیں کھلیں تو گل بدن نے حوصلہ بڑھایا۔ ''ہاں ہاں! روشن بس ایسے ہی۔''

روشن کے چہرے پر پسینہ اُتر آیا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا اور گل بدن تھی کہ اس کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر زور زور دبا رہی تھی۔

''تھوڑی اور کوشش کرو۔ اور کوشش۔ شاباش روشن۔ شاباش۔''

روشن نے جسم کی پوری طاقت سمیٹ کر پلکوں پر ڈال دی تب کہیں جا کر بڑی مشکل سے آنکھیں کھلیں۔ گل بدن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس کے جسم کی نسیں تنتی چلی گئیں۔ انگ انگ میں کساؤ سا پیدا ہو گیا۔

''دیکھو میری طرف........مجھے دیکھو.........دیکھو میں پنک ساڑی میں کیسی لگ رہی ہوں.......؟''

اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

''تم بولتے کیوں نہیں کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

وہ اِس بار بھی خاموش رہا۔

''تم چُپ کیوں ہو.........؟ بولتے کیوں نہیں کہ میں کتنی خوبصورت ہوں؟''

اس بار چپ رہنے کے باوجود اُس نے اِشارے میں کچھ کہنا چاہا۔لیکن گل بدن پر تو پاگل پن سوار تھا۔اس لئے وہ اشارے کی زبان کیا سمجھتی۔ بوکھلا اُٹھتی ہے۔ساڑی کی گانٹھ کمر سے کھولنے لگتی ہے۔پھر سنٹر ٹیبل پر ساڑی کو پھینکتے ہوئے ہیجانی کیفیت میں کہتی ہے۔

''دیکھو یہ کیا ہے........؟''

پہلی بار روشن کہتا ہے_____''مجھے کچھ دکھ نہیں رہا ہے۔''

''دیکھو یہاں کیا ہے.......؟''

''میں نے کہا نا کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''نہیں! تمہیں تو آج دیکھنا ہی ہوگا۔سارے زیور بیچے ہیں میں نے۔''وہ روشن کو جھنجھوڑنے لگی۔

''نہیں میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''روشن رونے لگتا ہے۔

''تمہیں تو دیکھنا ہی ہوگا کہ میں کیسی ہوں۔''گل بدن اُس کے بال پکڑ کر زور سے چلاّنے لگتی ہے۔

''میں نے کہا نا کہ مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا ہے۔''

''نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ڈاکٹر نے تمہارے سامنے کہا تھا کہ آپریشن

کامیاب رہا ہے۔''

''نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔''

''سچ بولو یا جھوٹ مجھے اِس سے کوئی مطلب نہیں۔ میں نے کہا نا کہ آج تمہیں ہر حال میں مجھے دیکھنا ہی ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے گل بدن تابڑتوڑ اُس کی آنکھوں پر وار کرتی چلی جاتی ہے۔ روشن خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ چیختا چلاتا ہے۔ گل بدن پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ اسی طرح مارتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ آنکھیں لہولہان ہوکر باہر نکل آتیں دروازے پر آہٹ ہوتی ہے۔

''مائی!.......اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔''

ایسے میں کوڑھی اس سے خیرات طلب کر رہا تھا۔ اُس وقت گُل بدن کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا۔ وہ دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اسکین

(SCAN)

یونیورسٹی لکچررشپ اکزامنیشن

2015

مضمون: اُردو

وقت: تین گھنٹے　　　　کل نمبر:300

سوال نامہ کے پانچ حصّے ہیں۔'الف'،'ب'،'ج'،'د'میں سے کسی تین کے جواب دیں۔

حصّہ۔'س'تمام طالب علموں کے لئے لازمی ہے۔

الف۔''نظم''(۱۵x۵=۷۵)

ب۔''نثر''(۱۵x۵=۷۵)

ج۔''تحقیق وتنقید''(۱۵x۵=۷۵)

د۔''تاریخ''(۱۵x۵=۷۵)

س۔''قواعد''(۱۵x۵=۷۵)

سوال:۱

''ڈاکٹر قمر نایاب نے'ایک سانولی لڑکی' میں وفا نگار کے کردار کو جس ہنرمندی سے تراشا ہے اس سے ناول میں جان پڑ گئی ہے۔''اس قول کی روشنی میں جواب دیں؟

سوال نامہ ملتے ہی سلطانہ نگار نے پڑھنا شروع کیا اور جیسے ہی حصّہ'ب'(نثر)

کے سوال نمبر۔۱ پر اس کی نظر پڑی، چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ پہلے اس نے سوچا کہ سارے سوالات حل کرنے کے بعد وہ اس پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرے گی۔ لیکن دوسرے ہی پل اس نے ارادہ بدل دیا کہ پہلے وہ اس سوال سے نبرد آزما ہوگی اور پھر بعد میں دوسرے سوالات حل کرے گی۔

پندرہ منٹ بعد گھنٹی بجتے ہی انوجیلیٹر نے کہا۔''اب لکھنا شروع کریں۔ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہدایت کی کہ سبھی کان کھول کر سُن لیں۔ان فیئر منس کرنے والے کو کسی بھی قیمت پر بخشا نہیں جائے گا اس لئے خاموشی سے اپنا اپنا کام کریں۔اتنا کہہ کر وہ مڑے ہی تھے کہ آواز آئی۔

''سر ایک گلاس پانی ملے گا۔'' جواب لکھنے سے پہلے ہی سلطانہ نگار کے ہونٹ سوکھنے لگے تھے۔

''ابھی لکھنا بھی شروع نہیں کیا اور پانی۔''انوجیلیٹر نے اُسے گھور کر دیکھا۔

گلا تر کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر سے سوال پر نظر ڈالی اور قلم سنبھال لیا۔

جواب:۱

اس میں شک نہیں کہ آج قمر نایاب کا شمار صف اول کے اردو ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔کئی ناول ہندوستان اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ تقریباً ۵/افسانوی مجموعے،۴/ناول اور تحقیقی وتنقیدی مضامین کی ۱۱/کتابیں اب تک شائع ہوچکی ہیں۔ملکی سطح پر ملنے والا بڑا سے بڑا ایوارڈ ان کے سامنے چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔۴۰ سے زیادہ پی ایچ ڈی اور تقریباً ۶۰ ایم فل ان کی نگرانی میں تکمیل کے مراحل طے کر چکے ہیں۔ رجسٹریشن ہوتے ہی ریسرچ اسکالر کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھتا ہے۔ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مطلب کیمپس سلیکشن۔سند ہاتھ آتے ہی سمجھئے کہ اسسٹنٹ پروفیسر کی نوکری جیب میں۔

جہاں تک ناول''ایک سانولی لڑکی'' کی بات ہے تو اس میں دورائے نہیں کہ

انھوں نے مرکزی کردار وفا نگار کو اپنے فن کی معراج سے وہ بلندیاں عطا کیں کہ صرف دو سال کے اندر اس ناول کے چار ایڈیشن شائع ہو گئے۔ ناول نگار نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ اپنی ادبی عیاشی کے لئے جس کردار میں حقیقت کا رنگ بھر رہے ہیں وہ کردار انہیں شہرت کی ان بلندیوں پر لے جائے گا۔

لیکن کیا کیجئے؟ انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں، اور جو ہوتا ہے اس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہوتا۔ سوچنے اور ہونے، ہونے اور سوچنے کے درمیان کا جو وقفہ ہے وہی دراصل ہماری کامیابی اور ناکامیابی کے صفحات رقم کرتا ہے۔

اب دیکھئے نا یہ کس نے سوچا تھا کہ یہ ناول اتنی جلدی نصاب میں شامل ہو جائے گا اور لیکچرر شپ جیسے امتحان میں اس سے سوال پوچھے جائیں گے اور جواب لکھنے والا کوئی اور نہیں اس ناول کا مرکزی کردار ہوگا۔ اب ایسے میں اگر حقیقی کردار آج اپنی زندگی کے ان پہلوؤں سے آنکھیں چرائے، جس پر مصنّف نے پردہ ڈال رکھا ہے تو وہ خود ادبی زنا کا مرتکب ہوگی۔

میرا اصلی نام سلطانہ نگار ہے۔ وفا نگار تو پروفیسر قمر نایاب کا رکھا ہوا ہے۔ پی ایچ ڈی کے دوران انہوں نے جو کچھ کہا۔ وہ میں نے کیا۔ اسی کے انعام میں مجھے 'وفا' کا نام ملا تھا۔ اکیلے میں وہ یہی نام لیتے تھے۔ نام رکھنے کے پیچھے جو محرکات ہیں اس کے متعلق انہوں نے ایک دن رازدارانہ انداز میں بتایا تھا کہ ''اب تک جتنی لڑکیاں میرے پاس آئیں ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ کام نکالو اور چلتا بنو۔ لیکن تم ان لڑکیوں سے الگ ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ کام کے عِوض آخر دم تک تم اپنی وفا سے خوش کرتی رہو گی۔ انعام میں تمہیں وہ سب ملے گا جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

اور واقعی میں نے کچھ سوچا نہیں تھا اس لئے بغیر کسی انعام و اکرام کے انہیں خوش رکھنے کی خواہش میں اپنی پوری وفاداری جھونک دی۔ لیکن انہیں اس سے مطلب نہیں تھا۔ ایک دن اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھایا اور پیٹھ سہلاتے ہوئے سمجھایا کہ ''ایسی

وفا داری تو ساری لڑکیاں دکھاتی ہیں اور ساتھ میں ہر ماہ کام کے عِوض موٹی رقم بطور فیس ادا کر جاتی ہیں ۔تمہاری مجبوری میں سمجھتا ہوں، اس لئے رعایت سے کام لے رہا ہوں ۔تم چاہو تو فیس میں رقم کے بدلے......'' پیٹھ سے ہاتھ سرکتا ہوا میرے کاندھے سے اوپر سے ہو کر نیچے کی طرف سرک گیا تھا۔ میرا سارا جسم لرز کر رہ گیا۔اس وقت میں نے سوچا کہ تھپڑ رسید کر دوں اور سارا کام چھوڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں ۔لیکن جیسے ہی نوکری کا خیال آیا، میرے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بکھر گئی ۔نوکری کے لالچ میں، میں ہر ماہ انہیں فیس دیتی رہی ہے ۔اس کے علاوہ میں کرتی بھی کیا؟ بچپن بے حد غریبی میں گذری تھی ۔ماں جب تک گھروں سے کام کر کے نہیں لوٹتی ۔ میں بھوکی رہتی ۔ بچا کھچا جوٹھا کھانا جو ساتھ لاتی تھی وہی کھا کر جوانی کی دہلیز تک پہنچی ۔اسکول اس لالچ سے جایا کرتی کہ وہاں پیٹ بھر دوپہر کا کھانا ملتا تھا۔ پھر یہ بات سمجھ میں آئی کہ غریبی سے نکل کر اگر عزت کی روٹی حاصل کرنی ہے تو تعلیم کی سڑک ہی وہاں تک پہنچا سکتی ہے ۔ میں خوب محنت کرنے لگی ۔ پہلے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا۔اس کے بعد آئی اے، بی اے (آنرس) اور پھر اردو میں ایم.اے۔ پچھتّر فی صد نمبر کے ساتھ میں یونیورسٹی میں اوّل رہی۔ گولڈ میڈل بھی ملا۔ یہاں سے آگے مجھے پی ایچ ڈی، نیٹ اور پھر لکچرر شپ کا سفر طئے کرنا تھا......میں جانتی تھی کہ یہ سفر میرے لئے آسان نہیں۔ پھر بھی میری ہمّت میرے پاؤں کی طاقت بنتی رہی۔

غریبی ہی امیری کے خواب دکھلاتی ہے۔ میں غریب ضرور تھی ۔لیکن میرے خواب امیر تھے۔ میں لکچرر بننا چاہتی تھی ۔ جب کہ ضرورت یہ کہتی تھی کہ بی ایڈ کر کے فوراً اسکول جوائن کر وا اور گھر کا خرچ چلاؤ۔ ماں بھی یہی چاہتی تھی ۔لیکن ہر بار میرے سپنے انہیں اس لکچرر لڑکی کے اسٹیٹس کے سامنے کھڑا کر دیتے تھے جس کے یہاں ماں دو تین سال سے کام کر رہی تھی ۔ میں ماں کے ساتھ ان کے گھر بھی گئی تھی۔ انہوں نے مجھے یہ کہہ کر پروفیسر قمر نایاب سے ملنے کے لئے کہا تھا کہ ''اگر انہوں نے تمہیں پی ایچ ڈی کے لئے منتخب کر لیا تو سمجھو لکچرر شپ پکّی ۔ بس اپنا خیال رکھنا۔ آدمی عاشق مزاج ہے ۔بغیر فیس کے وہ کوئی کام

نہیں کرتا۔تمہارے پاس پیسہ نہ سہی حسن تو ہے۔''

''سر پانی''

تقریباً چالیس طالب علموں میں سے کسی نے اب تک پانی کی خواہش نہیں کی تھی۔ آدھا گھنٹہ گذرتے ہی دوسری بار پانی کی فرمائش۔انوبجیلیٹر کو عجیب سا لگا۔اس نے اس بار بے دلی سے باہر نکل کر پانی پلانے والی خاتون کو اشارے سے بلایا۔

پانی حلق میں اُتارتے ہی اس کی شریانوں میں جیسے روشنائی دوڑنے لگی........

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ہر آدمی کو عاشق مزاج ہی پایا تھا اور جب آپ غربت میں جوان ہو رہے ہوتے ہیں تو امیری وقت بے وقت اسے اپنا مال سمجھ کر ترازو میں تولتی رہتی ہے۔کتنوں نے کوشش کی۔لیکن میں بچ بچا کر نکلتی رہی اور امید تھی کہ یہاں بھی اپنے دامن پر حرف نہیں آنے دوں گی۔لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔حرف کیا؟ پورے کے پورے الفاظ میرے اندر اُتارے گئے اور جملے پر جملے بنا کر ناول لکھے گئے۔سچ پر جھوٹ کی ملمع کاری کی گئی۔

یہاں تک کہ وفا نگار کے کردار کو بھی مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔جس پروفیسر چاند کے ساتھ اسے عشق کرتے دکھایا گیا ہے وہ پروفیسر کوئی اور نہیں خود قمر نایاب ہیں۔وفا کی عمر یہی کوئی ۲۴۔۲۵ سال ہے اور پروفیسر چاند ۵۷۔۵۸ کے لپیٹے میں ہیں۔ایسے میں وفا نگار کے اندر اپنے باپ کی عمر سے بھی زیادہ کے پروفیسر میں دلچسپی کا پیدا ہونا صرف اس لئے کہ وہ ادب کی خدمت کے بہانے اس کی خدمت گار بن جائے اور پروفیسر چاند اس کے بچّوں کا مستقبل سنوار دے۔یہ سراسر غلط ہے۔کیوں کہ میں جس نگار کو جانتی ہوں اس نے پروفیسر کو پی ایچ ڈی کے دوران ایک بیٹی کی نظر سے دیکھا تھا اور اسے اپنے باپ کا درجہ دیا تھا۔لیکن اس نے دو چار ملاقات میں ہی یہ صاف کر دیا کہ ''نہ وہ کسی ایسے رشتے میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی نبھانا چاہتے ہیں۔رشتہ داری نبھانے لگوں تو ریسرچ ہو گیا۔رشتہ صرف خون کا ہوتا ہے۔باقی سب نر ناری ہیں۔اس لئے جو ہو وہ بنے رہو۔ورنہ ریسرچ دھرا کا

دھرا رہ جائے گا۔ وائیوا تک کے لئے ترس جاؤ گی.........''لیکن وفا نگار تو اپنی منزل پانا چاہتی تھی۔ کام کرنے والی کی جو بیٹی تھی۔ آگے جو بڑھنا تھا۔

ناول میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''وفا نگار یہ بھی چاہتی تھی کہ پروفیسر چاند اس سے اگر شادی نہیں بھی کرے تو کم سے کم وہ اسے رکھیل بنا کر ساری زندگی اپنے پاس رکھے۔'' یہاں بھی مجھے اعتراض ہے۔ جب کہ سچائی یہ ہے کہ وہ مجھے ساری زندگی ''لِو اِن ریلیشن شپ'' کے طرز پر رکھیل بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ میں تو غریب گھر کی لڑکی ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور نوکری کے لالچ میں ان کے پاس آئی تھی۔ پانچ سالوں میں تین بار ابارشن کروا چکی تھی۔ لیکن یہ سب میری مرضی سے نہیں ہوا تھا۔ جہاں میں نے سال بھر میں اپنی پوری تھیسس تیار کر لی تھی وہیں انہوں نے جمع کروانے سے لے کر وائیوا تک میں کئی بار جان بوجھ کر روڑے اٹکائے اور ہر بار اس کی فیس لی مجھ سے۔

ناول میں پروفیسر چاند نے یہ بھی تہمت وفا نگار پر لگائی ہے کہ ایک دن جب موسم خراب تھا اور ہوا کے ساتھ تیز بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اسٹوڈنٹ بہت کم آئے تھے اس دن وہ بھیگتے ہوئے اس کے چیمبر میں داخل ہو گئی تھی اور اس نے اس کے ساتھ نازیبا حرکت کی تھی۔ لیکن اصل قصہ کیا ہے وہ میں بتاتی ہوں۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے میرا یونیورسٹی جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ گھر پر رہ کر ایک چیپٹر کی نظر ثانی کر رہی تھی کہ تبھی ان کا فون آ گیا۔ میں یہاں یہ بتا دوں کہ یہ موبائل سیٹ بھی ان کا ہی دیا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج ڈیپارٹمنٹ میں وہ آنے والے ہیں جن کے افسانوں پر میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ان سے ملنے کے لئے آنا پڑا۔ بھیگ کر۔ حالاں کہ چھتری میرے پاس تھی۔ لیکن پھر بھی بارش نے مجھے نہیں بخشا۔ جب میں ڈیپارٹمنٹ پہنچی تو دیکھا کہ وہ چیمبر میں اکیلے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، انہوں نے مجھے ایک کنارے لے جا کر دبوچ لیا تھا اور بیمار پڑ جانے کی بات کہہ کر الماری کے پیچھے جبراً بھیگے کپڑے اتروا دیئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے میرا ایم ایم ایس بنایا تھا۔ یہی وہ ایم ایم ایس تھا جس

کی وجہ سے وہ ہمیشہ مجھے بلیک میل کیا کرتے تھے کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں سنی تو وہ سوشل میڈیا میں اپ لوڈ کر دیں گے۔

ناول میں ایک جگہ قمر نایاب نے لکھا ہے کہ وفا نگار نے مجھے حاصل کرنے کے لئے پہلے میری بیوی سے دوستی کی اور پھر گھر آنے لگی۔ ایک دن اس نے اس کی بیوی کو کولڈ ڈرنکس میں کچھ ملا کر پینے کے لئے دیا اور غنودگی کی حالت میں پہنچتے ہی اسے گلا دبا کر مار دینا چاہا تھا۔ لیکن عین وقت پر پروفیسر چاند پہنچ گئے اور اس نے اسے بچا لیا۔ لیکن اکز امیز صاحب ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اپنی بیوی سے دوستی کرنے کے لئے اس نے خود کہا تھا تا کہ جب چاہیں وہ مجھے اپنے گھر بلا سکیں۔ جہاں تک کولڈ ڈرنکس کی بات ہے تو اس دن اس نے ہی مجھے بہانے سے بلایا تھا اور جب میں گھر پہنچی تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ میں نے انٹی سے کہا کہ سر نے مجھے ایک کتاب دینے کے لئے بلایا ہے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا کہ ابھی سر کا فون آیا تھا۔ راستے میں ہیں بس پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اس دن وہ اپنے ساتھ ہی کولڈ ڈرنکس لے کر آئے تھے اور بس اس میں اتنا ہی بچا تھا جتنا ایک آدمی پی سکتا ہو۔ اس نے یہ کہتے ہوئے انٹی کی طرف بڑھا دیا کہ بوتل میں میں نے منہ لگا دیا ہے۔ اس لئے تم.......وہ پی گئی تھی اور پیتے ہی اس کے منہ سے جھاگ آنے لگا تھا اور ایسے میں وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مل کر اس کا گلا دبا دوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان اس بات کو لے کر ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ پھر میں فوراً اسے کسی طرح آٹو رکشا میں لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگی۔ بعد میں ڈر کے مارے پیچھے سے وہ بھی ڈسپنسری آئے کہ کہیں معاملہ پولس کا نہ بن جائے۔ بیوی شریف تھی اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس لئے بات دب گئی۔ لیکن اس کے بعد میں محتاط رہنے لگی۔ ایک دن نشے کی حالت میں وہ سچ بات کہہ گئے۔ ''اگر اس دن میری بُڑھیا زہریلی کولڈ ڈرنکس سے مرگئی ہوتی تو آج تم راج کر رہی ہوتی۔ تمہیں تو ٹھیک سے نہ عیش کرنا آتا ہے اور نہ ہی کسی کو ٹھکانے لگا کر راج کرنا۔ میں نے تو اس دن پوری پلاننگ کے ساتھ تمہیں بلایا تھا تا کہ تم لاش کو ٹھکانے لگانے میں میرا ساتھ دو

گی۔''

''پانی...... پانی''

پھنسی پھنسی سی آواز اس کے گلے سے نکلی تھی۔ جیسے صدیوں کی پیاسی ہو۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی بہ مشکل سوا گھنٹے ہوئے تھے۔ اس دوران اس نے تین چار گلاس پانی پی لیا تھا۔ اتنا پانی وہ کبھی نہیں پیتی تھی۔ اسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اتنی پیاس کیوں لگ رہی ہے۔ انوبجیلیٹر اس کی حرکت سے تنگ آ چکا تھا۔ بس چلتا تو کمرہ تبدیل کر لیتا۔ لیکن اب ممکن نہیں تھا۔ ویسے بیچ میں ری لیور کو بُلا کر اس نے دس منٹ کے لئے اسٹاف روم میں چین کی سانس لی تھی۔

پانی پینے کے بعد اس نے آگے پھر سے لکھنا شروع کیا........

ناول میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے انہیں دھمکایا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر لیں نہیں تو میں انہیں جان سے مروا دوں گی۔ سچائی یہ ہے کہ وہ مجھے اکثر کہتے ہیں کہ'' تمہاری لائف کو سنوارنے کے لئے میں دن رات کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ جس دن تم نے مجھے چھوڑنے کی حماقت کی کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ لاش کہاں گئی۔'' اور اب مجھے شک ہو رہا ہے کہ مجھ سے قبل جس لڑکی کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے اس کے ساتھ کسی بات کو لے کر تلخی پیدا ہوئی تھی اور اس کے کچھ ہی دن بعد سے وہ غائب ہے۔ پولس اب تک اسے ڈھونڈ نہیں پائی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے غائب ہونے میں پروفیسر کا ہی ہاتھ ہو۔

یہ سچ ہے کہ میں نے انہیں کسی طرح کا کوئی پیسہ نہیں دیا۔ لیکن وائیوا کے لئے جو پیسے کی بات کر رہے ہیں کہ انہوں نے ایکسٹرنل کو تھیسس سائن کرنے کے لئے بیس ہزار روپئے دئے، وہ غلط ہے۔ ویسے انہوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ایکسٹرنل جب تک بیس ہزار روپئے نہیں لیں گے تب تک سائن کرنے والے نہیں۔ اس لئے جیسے بھی ہو کہیں سے اتنے پیسے کا انتظام کرو۔'' میں رونے لگی تو اس نے مجھے سہارا دیتے ہوئے کہا۔'' ٹھیک ہے تمہاری فیس میں بھر دوں گا۔ میرا مطلب تمہیں فیس جمع کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بس تم وائیوا

سے قبل والی رات ایک گھنٹے کے لئے اس ہوٹل میں پہنچ جانا جہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ میں گئی تو ایک گھنٹہ کے لئے تھی۔لیکن وہاں دو گھنٹے سے بھی زیادہ رکنا پڑا۔انٹرنل بھی اپنی آخری فیس وصول کرنے لگے تھے۔ میں اس لائق نہیں رہی تھی کہ وائیوا دے پاتی۔لیکن کسی طرح وائیوا میں شامل ہوئی۔ کیا کیا پوچھا گیا۔ مجھے ابھی بھی صحیح سے کچھ نہیں معلوم۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایکسٹرنل نے کہا تھا کہ آپ کی ریسرچ اسکالر ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔ اور پھر ان کے ساتھ ساتھ انٹرنل نے بھی مجھے کامیاب انٹرویو دینے پر مبارک باد دی تھی۔ پھر کس نے مجھے ہسپتال میں ایڈمِٹ کروایا تھا مجھے نہیں معلوم۔ایک نیام میں دو تلواریں۔اللہ کی پناہ۔

وفا نگار کو کمزور ریسرچ اسکالر کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ وفا نگار نے اپنا ریسرچ پیپر خود تیار کیا ہے۔ وہ بھی ایک بار نہیں دوبار۔''میں اپنے ریسرچ اسکالر کو زحمت نہیں دیتا۔سارا کام پیشہ ورانہ لوگوں سے کروا تا ہوں۔''لیکن میرے پاس ڈیڑھ لاکھ روپئے کہاں تھے۔تب انہوں نے مجھے کسی کی زیراکس تھیسس دی کہ اس پیٹرن پر پہلے مقالہ تیار کرکے دکھاؤ۔الگ سے انہوں نے ایک عنوان بھی دیا۔ میں نے اپنی ساری محنت تین ماہ تک اس پیپر کو تیار کرنے میں جھونک دی۔اور جانتے ہیں میرے اس مقالے کا کیا ہوا۔ جاننے کے بعد بہت سارے پروفیسروں کی صلاحیت پر سے ایمان اُٹھ جائے گا۔ لیکن نہیں بتاؤں تو یہ بھی ادبی بددیانتی ہوگی۔اسی مقالے پر انہیں ڈی لِٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ان کی نہیں ہوگی۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایم اے کی ڈگری بھی جعلی ہو۔اور وہ ساری کتابیں جو ان کے نام سے چھپی ہیں ہوسکتا ہے میرے جیسے کسی غریب کی تحریر ہو۔اتنا جاننے کے بعد اکزامینر صاحب کیا آپ کسی ایسے فراڈ پروفیسر کے پاس اپنی بہو بیٹیوں کو ایم فل یا پی ایچ ڈی کے لئے بھیج سکتے ہیں؟

مجھے اس سوال کے جواب میں جو کچھ سمجھ میں آیا وہ میں نے لکھ دیا۔امتحان کے پیپر میں ذاتی زندگی کے متعلق اس طرح سے لکھا جاتا ہے یا نہیں یہ مجھے نہیں معلوم۔اب

فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اگر آپ کا کردار بھی پروفیسر چاند جیسا ہے اور آپ بھی پروفیسر چاند کی طرح پاس کرنے کے لئے فیس وصول کرنے والے لوگوں میں ہیں تو مجھے جگہ بتا دیں کہ میں کہاں آؤں۔ یہ میرا موبائل نمبر ہے اور اگر آپ ویسے نہیں ہیں تو نیچے میرے گھر کا پتہ ہے آپ جب چاہیں آئیں آپ کا خیر مقدم ہے۔

''سر پانی''

وقفے وقفے سے طالب علم پانی کی خواہش ظاہر کر رہے تھے۔ لیکن جب دو گھنٹے کے اندر اس نے چوتھی بار پانی کے لئے کہا تو انویجلیٹر کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا یا پھر اسے لگا کہ وہ اسے ڈسٹرب کرنا چاہتی ہے یا پھر باہر نکل کر پانی پلانے والی کو آواز دیتے وقت وہ چِٹ نکالتی ہے۔ اس نے ایک میڈم کو بلایا۔ تلاشی لی گئی۔ جب کچھ نہیں ملا تو غصّے میں چار پانچ گلاس پانی اس کے ڈیسک کے سامنے رکھ دیا۔

اس وقت سلطانہ نگار کو انویجلیٹر کی حرکت بُری نہیں لگی تھی اور نہ ہی اُس نے کچھ سوچا تھا کہ صرف اُس کی ہی تلاشی کیوں لی گئی۔ وہ تو اپنی دُھن میں تھی۔ لیکن پانی سے بھرے کئی گلاس دیکھ کر وہ مسکرائی ضرور تھی۔ اُس وقت ایک بار اس نے انویجلیٹر کی طرف شکریہ بھری نظروں سے دیکھا تھا اور جلدی میں ایک گلاس پانی اپنے اندر غٹک لیا تھا۔

اس کے بعد دوسرے سوالات جلد بازی میں حل کئے گئے۔

پیپر جمع کرنے کے بعد سلطانہ نگار خود کو بہت ہلکی محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ جس بہانے بھی ہو اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ لیکن وہ ڈر رہی تھی اپنی غریبی سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات پروفیسر قمر نایاب تک پہنچ جائے اور نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کیوں کہ بچپن سے غریبی کی مار جس طرح سے جھیلی تھی اس سے وہ اپنی آنے والی نسل کو باہر نکالنا چاہتی تھی۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ کیا اب وہ اس سے باہر نکل پائے گی؟ اس لئے وہ کچھ پریشان بھی تھی۔

امتحان والی رات جب پروفیسر کا فون آیا تو اس نے بتا دیا کہ پیپر ٹھیک ہوا ہے۔

وہ خوش ہوئے اور بولے۔''بس ایک دو ماہ میں پوسٹ نکلنے والا ہے، میں تمہیں جس طرح سے بھی ہوگا سلیکشن کروادوں گا۔تب تک لکچرر شپ کا ریزلٹ بھی آجائے گا لیکن اتنا یاد رکھنا کہ سلیکشن کی فیس الگ ہوگی۔سمجھی۔''لیکن اس نے ''ہاں۔ہوں'' سے زیادہ بات نہیں کی۔امتحان میں دل کھول کر اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد وہ دور دور رہنے لگی تھی۔اس بات کا نوٹس پروفیسر نے بھی لیا تھا۔لیکن طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر وہ زیادتر گھر پر ہی رہنے لگی تھی۔اس کے بعد کئی فون آئے لیکن اس نے اُٹھایا نہیں۔ایک دن وہ اس کی خیریت جاننے گھر تک پہنچ گئے تھے۔

لیکن جو لکھا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔سلطانہ نگار کی کاپی چیک ہونے کے لئے جس ٹیبل پر پہنچی وہ اکزامنر کوئی اور نہیں خود پروفیسر قمر نایاب تھے۔

اس نے چپکے سے کاپی اسکین کروالی۔

اور پھر ایک دن ایک خاص مقام پر سلطانہ نگار کو بلایا گیا۔اور جب اس کے سامنے اسکین کی ہوئی کاپی پٹکی گئی تو اس کے ہوش اُڑ گئے تھے کہ اب اس کی زندگی کا سارا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔اس کے سامنے اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ فیس چکا کر غلطی معاف کروالی جائے۔

پروفیسر قمر نایاب بھی اس کے لئے تیار ہو گئے تھے اور مسکراتے ہوئے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ بھی دیا تھا اور اس نے کیش نکالنے کے لئے کمر کی گانٹھ بھی کھول لی تھی۔بس معافی نامہ پر دستخط ہونا باقی رہ گیا تھا کہ اچانک اسکین کاپی کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے اور حروف آواز میں تبدیل ہو کر اس کی سماعت کے پردے چاک کرنے لگے۔

''کیا پوری زندگی فیس چکاتی ہی رہوگی یا کبھی وصول بھی کروگی؟''

دوسرے دن اسکین کی ہوئی کاپی میڈیا کی زینت تھی۔

☆☆☆

سانپ سیڑھی

محبوب رہنُما کی محبوبیت کسی سے ڈھکی چھُپی نہیں تھی اس لئے سب کے سب اُن کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

عمران بٹ بھی اُن کا دیوانہ تھا اور اُس نے بھی اُن کی محبوبیت کے در پر اپنا سر جھکا دیا تھا۔ جس کے باعث اسے بھی پارٹی میں اچھی جگہ مل گئی تھی۔ پارٹی لائن پر چلتے ہوئے اُس نے نہایت ہی ایمانداری سے بے شمار کام کئے۔ اور ایک دن اُسے ایسا لگا کہ آنے والے دنوں میں اُسے اس کا انعام ضرور ملے گا۔ کہیں نہ کہیں ٹکٹ کی صورت میں یا پھر کسی بڑے عہدے کے طور پر۔

ایماندار شخص آج کی سیاست کا حصّہ نہیں ہوسکتا اور اگر ہوتا ہے تو نہ وہ سیاست کر سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی داؤں پیچ سے پارٹی کو فائدہ ہی پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اب پارٹی میں اُس کی اہمیت بڑھنے لگی تھی۔ محبوب رہنُما براہِ راست اس سے فون پر اس علاقے کے مسائل پر رائے مشورے کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ مطمئین تھا کہ آنے والے انتخاب میں اُسے اس کی ایمانداری اور محنت کا پھل ضرور ملے گا۔

لیکن اس کی اس سوچ پر موسم نے اچانک گرہن لگا دیا تھا۔

بوڑھی ماں کو ایک سرد رات نے آغوش میں لے لیا تھا۔ اس دن سے والد صاحب کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اس لئے اس کا زیادہ وقت ان کی دیکھ بھال میں گذرنے لگا تھا۔

ایک بار پھر موسم نے انگڑائی لی اور بادلوں میں جگہ جگہ سلوٹیں پڑ گئیں۔ دیکھتے ہی

دیکھتے بارش نے ایسے تماشے دکھائے کہ جنت کو دوزخ میں بدلتے دیر نہیں لگی۔ والد صاحب کی طبیعت کچھ اور خراب ہوگئی۔

ایک ہفتے تک مسلسل بارش نے اپنا قہر ایسا برپا کیا کہ پورا علاقہ قبرستان میں بدل گیا۔ ہر طرف ملبہ ہی ملبہ تھا۔ لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

وقت رہتے جو لوگ اونچی جگہوں پر، پہاڑوں پر یا لاشوں کی ڈھیر پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے تھے، وہی بچ گئے تھے۔ بچنے والوں میں ایک خوش قسمت عمران بٹ بھی تھا۔ لیکن یہ خوش قسمتی اپنے گھر کے پانچ افراد کو ایک ایک کر کے گھر سے بہتے ہوئے دیکھنے کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ وہ سبھی نچلی منزل میں تھے اور وہ والد صاحب کے ساتھ اوپری منزل میں۔ کچھ دیر قبل علاج کے لئے یہاں ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ لیکن جاتے وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ اسے دیکھ کر عمران کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب تیز بارش میں آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کسی طرح ڈسپنسری لانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ اپنی گاڑی اور ڈرائیور دینے کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن خراب ہوتے ہوئے موسم میں گاڑی لے کر جانا اور انہیں سوار کر کے ڈاکٹر صاحب کے یہاں لانا اور پھر لے جانا موت کو دعوت عام دینے جیسا تھا۔ اس لئے اس نے ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ڈاکٹر صاحب! ایسا ظلم نہیں کیجئے۔ ایسے موسم میں اُن کا لانا لے جانا خطرے سے خالی نہیں۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو حالت بے حد نازک تھی۔ آپ چل کر انہیں دیکھ لیجئے۔ شاید آپ کے ہاتھوں کی تاثیر مجھے یتیمی کے دکھ سے بچا لے۔''

اُنہیں مجھ پر ترس آ گیا اس لئے مجبوراً انہیں میرے ساتھ گھر آنا پڑا۔ گھر سے نکلتے وقت انہوں نے کہا تھا ''عمران صاحب! آپ لیڈر کم سماجی کارکن زیادہ ہیں۔ اس لئے اتنے خراب موسم میں میں آپ کے والد کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ لیکن میرا دل اب بھی کہہ رہا ہے کہ اس موسم میں گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن زندگی کا معاملہ ہے اس لئے.........لیکن اگر موسم کچھ اور خراب ہوا تو ہو سکتا ہے کہ مجھے آپ کے گھر ہی رُکنا پڑے۔

ٹھہرنے کا انتظام ہو جائے گا نا عمران صاحب........؟

''جی! آپ اس کی فکر نہ کریں۔بس جلدی چلیں۔''

ڈاکٹر صاحب کو لے کر عمران بٹ اوپری منزل پہنچا۔ڈاکٹر نے معائینے کے بعد اور کاغذ پر دوائیاں لکھ دیں اور ہدایت کی کہ جلد کسی میڈیکل شوپ سے جا کر لے آئے۔ جب وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر گھر آ رہا تھا تو اسے ایک بھی میڈیکل اسٹور کھلا نظر نہیں آیا تھا۔ اس لئے عمران بٹ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب اس وقت کوئی میڈیکل اسٹور........؟''

''ارے بھائی! نہیں کھلا ہوگا تو میں کیا کروں........؟''

''ڈاکٹر صاحب! اب تو جو کچھ کرنا ہے وہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ورنہ........''

عمران بَٹ کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔بہت منت سماجت کر کے وہ ڈاکٹر صاحب کو لایا تھا،لیکن بروقت دوا نہیں ملی تو پھر ڈاکٹر کا آنا نہ آنا کوئی مطلب نہیں تھا۔اس لئے ایک بار پھر اس نے ہاتھ جوڑ لئے۔''ڈاکٹر صاحب! آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ شہر میں ایسا کون ہے جس نے گھر میں میڈیکل اسٹور ہے یا پھر گوڈون بنا رکھا ہے۔اگر والد محترم کو دوا نہیں ملی تو پھر ڈاکٹر صاحب.........کچھ کیجئے ڈاکٹر صاحب........آپ ایسے بھی مریضوں کے لئے زمینی خدا ہیں اور خدا کے ہوتے ہوئے مریض دوا کے بغیر مر جائے تو سمجھئے کہ قیامت سر پر ہے۔''

عمران بَٹ ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑانے لگا تھا۔

اسی وقت باہر زور سے بجلی گرجی۔ڈاکٹر صاحب نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔والد صاحب پر ایک نظر ڈالی۔دل ہی دل میں کچھ سوچا اور پھر اپنے ایک دوست کو فون کیا۔مثبت جواب ملتے ہی وہ عمران بَٹ کو لے کر ان کے گھر پہنچے۔دوا دلوانے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اس خراب موسم میں وہ عمران بٹ کو چھوڑنے اس کے گھر تک آئے۔اس وقت تک ایکا دُکّی پرائیوٹ گاڑیاں چل رہی تھی۔پسنجر گاڑیوں کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

موسم کچھ اور خراب ہو گیا تھا۔

بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔

ہواؤں کا تیز جھکڑ ایسا شور برپا کر رہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے عمران کو دروازے پر چھوڑا تھا اور گاڑی موڑ کر اپنے گھر کا رخ کیا تھا۔ موسم خراب ہونے پر وہ رکنے والے تھے۔ عمران نے رکنے کے لئے کہا بھی تھا۔ لیکن اس وقت بیوی، بچے یاد آ گئے اور وہ چاہ کر بھی نہیں رکے۔

لیکن جیسے ہی گاڑی موڑ کر ڈاکٹر صاحب اپنے گھر کی طرف بڑھے اور عمران بَٹ سیڑھیوں سے ہوتا ہوا اوپری منزل تک پہنچا۔ بارش اچانک کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ اور پھر اچانک ایسا شور برپا ہوا جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ نشیبی علاقوں میں ہاہا کار مچ گیا تھا اور پانچ منٹ کے اندر اندر پانی کے تیز بہاؤ میں ڈاکٹر صاحب کی وہ گاڑی اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی نشیب کی طرف جاتی دکھائی دی۔

عمران بَٹ کی سانسیں ایک پل کے لئے رُک گئی تھیں۔ اُسے لگا کہ اُس کی خود غرضی نے ایک ڈاکٹر کی جان لے لی ہے۔ ابھی وہ سنبھلتا کہ اس سے پہلے ہی اس نے دیکھا کہ اچانک پانی نچلی منزل تک پہنچ آیا ہے اور دونوں منزل کے درمیان کا راستہ جو سیڑھیوں کی صورت میں نہ جانے کب سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ الگ ہو گیا تھا اور بیوی اور چار بچے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے بہتے چلے جا رہے تھے۔

ماں کا غم ابھی تازہ ہی تھا۔ پندرہ دن بھی کیا دن ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی جب بھولنے والی شخصیت ماں ہو تو صدیاں کم پڑ جاتی ہیں۔

والدِ محترم کو اسی غم نے اندر سے چور چور کر دیا تھا۔ وہ ماں کو ایک پل بھی اپنے سے دور نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قبرستان سے لوٹے تو پھر سنبھل نہیں پائے۔ پندرہ دنوں میں وہ نہایت کمزور ہو گئے تھے۔ حالاں کہ انہیں کوئی ایسی بیماری نہیں تھی۔ بس بڑھاپا ہی ایک بیماری تھی۔ لیکن اِدھر سانس لینے میں انہیں پریشانی ہونے لگی تھی اور دل کی دھڑکن

میں بھی بے ترتیبی در آئی تھی۔ ایک دو دن ہسپتال میں بھی رہے۔ دوائیاں چل رہی تھیں۔ لیکن موسم کی اچانک خرابی نے ان کی طبیعت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

شکر ہوا اُس ڈاکٹر کا کہ ناموافق حالات میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر آئے اور یہیں سے جنت کا رختِ سفر باندھا۔

پانی کچھ اور بڑھ رہا تھا۔

اب پانی کا بھوت نچلی منزل سے ہوتا ہوا اوپری منزل پر آ گیا تھا اور تیزی سے پلنگ کی اوپری سطح پر پاؤں پسارنے لگا تھا۔ عمران گھبرا گیا۔ فوراً والد صاحب کو کاندھے کے سہارے چھجّے پر چڑھا دیا اور خود بھی چڑھ گیا۔ پانی دیکھتے ہی دیکھتے چھجّے کی نچلی سطح کو چھونے لگا تھا۔ موت کو قریب پا کر اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اب کوئی راستہ نہیں تھا کہ والد صاحب کو لے کر وہ بھاگ سکے۔ اوپر ٹین کے شیڈس تھے۔ چوبیس گھنٹے تک پانی چھجّے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اس دوران والد صاحب کی طبیعت اور بھی نازک سے نازک ہوتی چلی گئی تھی۔ یتیمی کا خوف اس کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اور وہ ہر لمحہ اللہ سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

پھر اُس کی یہ دعائیں اڑتالس گھنٹے کے بعد اس طرح قبول ہوئیں کہ پورا مکان ڈھہ گیا۔ اس سے پہلے کہ دونوں ملبے میں دب کر قصّہ ٔ پارینہ بن جاتے، عمران والد کو بچا کر نکلنے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ پورا علاقہ قبرستان میں بدل چکا تھا۔ عمران بٹ کا گھر اونچائی پر تھا۔ اس لئے بچ گئے تھے۔ ورنہ ہزاروں لوگوں کی طرح وہ دونوں بھی لقمۂ اجل بن گئے ہوتے۔

جب تک عمران بَٹ جان بچانے کی فکر میں تھا تب تک بیوی بچّوں کا درد اتنا نہیں بڑھا تھا۔ لیکن جیسے ہی خود کو محفوظ سمجھنے لگا، چاروں بچّے اور بیوی کا چہرہ پانی میں ہچکولے کھاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ زندگی اندھیرے میں ڈوبتی دکھائی دینے لگی۔ لیکن اس ڈوبتی زندگی کا واحد سہارا والد محترم خوش قسمتی سے زندہ تھے۔

لیکن قدرت کا کھیل دیکھئے کہ نامساعد حالات میں جب والد صاحب کے بچنے

کی اُمیّد کم سے کم ہوتی جا رہی تھی تو وہ بچ گئے۔ لیکن پھر وہاں سے شروع ہوئی اُنہیں نئے سرے سے بچانے کی جدو جہد۔

اس عالم پریشانی میں زندگی کے لئے جدو جہد کرنا کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔

ایسے روح شکن لمحات میں عمران بٹ والد صاحب کو کاندھے پر اُٹھائے گرتے پڑتے اونچی پہاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب والد اس کے کاندھے سے پھسل کر ملبے سے الجھ گئے تھے۔ اُس وقت عمران کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ لیکن اسی اثناء اللہ کا کرم اس کے بازوؤں میں سمٹ آیا تھا۔ تبھی وہ والد کو اس ملبے سے نکالنے اور اسی حالت میں دوبارہ کاندھے پر رکھنے میں کامیاب ہوا تھا.........کچھ آگے جا کر اس نے ایک گڈھے کے جمع پانی سے ہاتھ منہ صاف کیا۔ سانسوں کی آمد و رفت پر نظر ڈالی۔ دل کی دھڑکن کو محسوس کیا۔ اس وقت عمران کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ لیکن کپڑوں کے بھیگ جانے اور ملبے سے سنے ہونے کی وجہ سے والد صاحب کا جسم کچھ اور بھاری ہو گیا تھا۔ اس لئے انہیں لے کر چلنے میں کچھ پریشانی ہو رہی تھی۔

لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا کہ اس آفتِ ناگہانی میں بھی والد محترم اس کے ساتھ تھے۔

کبھی عمران بَٹ ان کے کاندھے پر ہوتا تھا، لیکن آج والد کو کاندھے پر اُٹھا رکھا تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل جب ایسی مصیبت آئے گی اور وہ والد محترم کی عمر کو پہنچ جائے گا تو پھر اُسے کاندھے پر کون سوار کرے گا؟ کیوں کہ سوار کرنے والے دونوں بیٹے خود لہروں پر سوار ہو کر اتنی دور جا چکے تھے، جہاں سے لوٹنا ناممکن تھا۔

ایک ہفتہ تک اس ناگفتہ با حالات میں عمران بَٹ نے پہاڑ کے اوپر ایک گھنے درخت کے نیچے گذارا۔ گھر سے بھاگتے وقت اس نے والد کے لئے جو بسکٹ، بریڈ اور کچھ فروٹس خریدے تھے اسے ساتھ لے لیا تھا۔ یہی اسباب چار دن تک والد محترم کے مردہ جسم میں سانس بھرنے کے کام آئے۔

پانچویں اور چھٹے دن ہیلی کاپٹر سے بریڈ اور پوڑی سبزی کا پیکٹ گرایا گیا۔ کسی طرح وہ دونوں دن ایک ایک پیکٹ لوٹنے میں کامیاب ہوا۔ پیکٹ کے اوپر لکھا تھا۔
''حکومت کو آپ کی جان کی پرواہ ہے۔ ہزاروں فوجی حفاظت کے لئے لگا دیئے گئے ہیں۔ موسم سازگار ہوتے ہی دور دراز کے علاقوں میں پھنسے ہوئے تمام لوگوں کو ہیلی کاپٹر سے نکال کر اُنہیں بہ حفاظت گھر تک پہنچایا جائے گا۔ اپیل ہے کہ ہمّت سے کام لیں اور اس آفاتِ ناگہانی کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔''

راحت اور بچاؤ کے کام میں فوج پوری طرح سے جُٹی ہوئی تھی۔ کئی نے اپنی جان پر کھیل کر لوگوں کو بچایا تھا اور کئی نے بچانے میں اپنی جان تک گنوا دی تھی۔ ملک کا ایک ایک فرد دعائیں مانگ رہا تھا۔ میڈیا کا رول بہت اہم تھا۔ ہیلپ لائنیں کھولی گئیں۔ امدادی فنڈ یکجا کرنے کے لئے کئی تنظیمیں سامنے آئیں۔ تجہیز و تکفین کے لئے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ حکومت کی ساکھ بچی رہے اس کے لئے مرنے والوں کی اچھّی خاصی قیمت لگائی گئی ــــــ اس آفت سے مقابلہ کرنے کے لئے ملک کا ہر شخص اپنے اپنے طور پر کوشاں تھا۔ جس سے جو بن رہا تھا کر رہے تھے۔ لیکن آفت اتنی بڑی تھی کہ اُس سے فوری طور پر نپٹنا آسان نہیں تھا۔

اس آفت زدہ موسم میں والدِ محترم کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ عمران بَٹ کو ڈر ستانے لگا تھا کہ کہیں ہیلی کاپٹر آنے سے پہلے وہ اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ اب اس کے اندر اتنی طاقت نہیں بچی تھی کہ وہ والد کو کاندھے پر اُٹھا کر چل پاتا۔ لیکن اس سے پہلے کہ متاثرین کے لئے حکومت ہیلی کاپٹر بھیجتی۔ سیاسی کھیل شروع ہو گیا۔

انتخاب میں بس تین ماہ کا وقت تھا اس لئے ہر کوئی داؤں پیچ میں لگا ہوا تھا۔ ایسے میں متاثرین کو بچانے کے لئے ہر کوئی پہل کرنا چاہتا تھا۔ سہرا بندھوانا چاہتا تھا۔ اس لئے پارٹیاں بیان بازی پر اُتر آئی تھیں۔ خراب موسم اب بھی چنوتی بنا ہوا تھا۔ لیکن ایسے میں جب عمران بَٹ کو معلوم ہوا کہ اس کا محبوب رہنُما شعبۂ موسمیات کی رخنہ اندازی کے باوجود متاثرین کو بچانے آ رہے ہیں تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ بار بار والد کے کانوں میں کہتا۔

''ابّا جان ! میں نہ کہتا تھا کہ میرے محبوب رہنُما سب سے ہٹ کے ہیں ۔وہ آ رہے ہیں۔آپ کو مرنے نہیں دیں گے۔''

اس کے بعد عمران اپنے ہاتھوں پر اپنے والد کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کرتا۔ آنکھیں اس طرح کھلتیں جیسے وہ اس کے محبوب کا شکریہ ادا کر رہے ہوں ۔ایسے میں عمران اپنی خوشی نہیں روک پاتا۔والد سے لپٹ جاتا۔ بند ہوتی پلکوں پر ہونٹ ثبت کر دیتا۔فرطِ مسرّت سے کہتا۔

''اب آپ کو کچھ نہیں ہوگا ابّا جان ۔بس کچھ اور دیر انتظار کریں میرے محبوب رہنُما آتے ہی ہوں گے۔''

وہ دل ہی دل میں اپنے محبوب رہنُما کے اس جذبے کو سلام کر رہا تھا کہ کوئی ایسا ہے جو ضرورت پڑنے پر عوام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے۔اور پھر وہ تو اس پارٹی کا ایک ایسا رہنُما تھا جس کی ایمانداری اور کام کی وجہ سے پارٹی میں اس کا قد کچھ اور بڑھ گیا تھا۔لیکن ٹکٹ ملے گا یا نہیں اس کو لے کر سوال تھا۔کیوں کہ اس کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنے لئے ایک کار خرید تے۔اور اب جو کچھ تھا وہ بھی سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔امید وار کے پاس انتخاب میں اُلٹے سیدھے کاموں کے لئے بھی پیسے ہونے چاہئے ۔ٹکٹ ملے نہ ملے،لیکن اسے آج اپنے محبوب رہنُما پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لائق ہیں کہ اُٹھتے بیٹھتے سلام کیا جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس کے محبوب رہنُما پچاس ہیلی کاپٹر کے ساتھ پہنچنے والے تھے۔ مصیبت زدوں کو جہنم سے نکال کر محفوظ مقام پر لے جانے والے تھے۔اس وقت عمران بَٹ کے لاغر جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ اپنے والد کو کاندھے پر،کبھی گود میں،اور کبھی چادر کی گٹھری بنا کر رات کے اندھیرے میں پہاڑی ڈھلان پر ہزاروں فٹ کی اونچائی سے نیچے تک پہنچنے کی ضد ٹھان لی تھی۔آخر کار اس کی ضد نے والد محترم کو نیچے تک اُتارنے میں اس کی مدد کی۔

جب وہ گرتے پڑتے ہیلی پیڈ تک پہنچے تو وہاں موجود پولس والے اس کی طرف دوڑے ۔ سب سے پہلے چادر کی گٹھری کو کھول کر والد صاحب کو زمین پر لٹا یا گیا۔ والد صاحب وہاں تک پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہو گئے تھے۔جسم میں تو پہلے بھی جان باقی نہیں رہی تھی ۔لیکن چادر میں بندھے بندھے وہ اور بھی پژمردہ ہو گئے تھے۔ پولس والے نے والد صاحب کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔وہ تھوڑا بہُت سُگبُگائے تو عمران بَٹ کی جان میں جان آئی۔ ورنہ اسے ایک لمحہ کے لئے ایسا لگا کہ کہیں وہ اپنی ہی لاش ڈھوتے ہوئے ہیلی پیڈ تک نہیں پہنچا تھا۔

پھر اس نے پولس والے سے بوتل لے کر والد صاحب کو تھوڑا پانی پلایا۔ دھیرے سے انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔خوشی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ پھر تھوڑا سا چنا اور پانی اپنے پیٹ میں اُتارا۔نسوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔لیکن جب لوگوں کی لمبی لائن دیکھی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وہ گھبرا گیا تھا کہ اب کیا ہوگا.........؟

خبر ملتے ہی لوگ باگ یہاں رات سے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بھیڑ اتنی تھی کہ اگر ہزاروں ہیلی کا پٹر بھی پہنچ جاتے تب بھی سبھوں کو بحفاظت نکال پانا مشکل تھا۔ اس نے پولس والوں سے منّت سماجت کی ۔ ایک دو کے پیر پکڑے تو انہوں نے والد صاحب کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے اُسے سب سے آگے کھڑا کر دیا۔لوگوں نے احتجاج کیا۔ بھیڑ میں آدھے سے زیادہ کی حالت نازک تھی ۔ اور سب یہی چاہتے تھے کہ اُنہیں سب سے پہلے اس سیلابی نرک سے نکالا جائے۔

عمران بَٹ والد صاحب کو کاندھے پر اُٹھائے صبح سے ہی لائن میں اور وہ بھی سب سے آگے کھڑا تھا۔اس لئے مطمئین تھا کہ اگر ایک بھی ہیلی کا پٹر مدد کے لئے یہاں پہنچا تو اُسے اُس میں جگہ مل جائے گی اور پھر وہ جلد سے جلد والد محترم کا علاج کروا سکے گا۔

اب دن کی سوئی کے چھوٹے بڑے دونوں کانٹے اپنی اپنی مسافت طے کر کے بارہ نمبر کے اوپر جمع ہو گئے تھے۔

ہیلی کاپٹر کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی ــــــــــ پولس والے بھیڑ کو اُس طرف جانے سے روک رہے تھے۔ساتھ ہی ساتھ تاکید بھی کر رہے تھے''کہ اگر کسی نے لائن توڑ کر آگے آنے کی ہمّت کی تو اُسے سب سے پیچھے کھڑا کر دیا جائے گا۔''

اس اعلان کے بعد بھیڑ میں کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔کوئی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پولس والوں کی نظروں میں آئے اور اُسے لائن کے آخر میں کھڑا ہونا پڑے۔اگر ایسا ہوا تو وہ اس سرد موسم میں جیتے جی یہاں مر جائے گا..........لیکن اس کے باوجود ہر کسی کی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح سے وہ لائن میں آگے پہنچ جائے۔

عمران بَٹ لائن میں سب سے آگے تھا۔اس لئے پہلے ہیلی کاپٹر میں جگہ ملنا طے تھا۔لیکن والدمحترم کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لائن میں سب سے پیچھے بھی ہوتے تب بھی اُسے امید تھی کہ اس کے محبوب رہنُما جب پُرسان حال لوگوں کی خبر لینے کے لئے ہیلی کاپٹر سے اُتر کر بھیڑ سے ہوتے ہوئے والدمحترم کے پاس پہنچتے تو اُسے آگے لے جانے کے لئے کہتے۔

وہ یوں تو اپنے محبوب رہنُما سے اس سے پہلے بھی مل چکا تھا۔وہ اندر سے خوش تھا ۔اس نے سوچا تھا کہ جیسے ہی وہ سامنے آئیں گے تو وہ انہیں پہچان لیں گے۔اگر خستہ حالی کے باعث نہیں بھی پہچان پائے تو وہ انہیں بتائے گا کہ وہ عمران بَٹ ہے۔پارٹی کا ایک رکن ۔محلّے میں کافی کام کیا ہے۔ڈرائنگ روم میں اُن کی ہی قدآور تصویریں ہیں۔دن رات وہ پارٹی کے مستقبل کے لئے دعائیں کرتا ہے کہ آنے والے انتخاب میں ملک کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں ہو،تاکہ ترقّی کا گراف اس تیزی سے اوپر اُٹھے کہ پانچ سال میں اپنا روپیہ، ڈالر کے برابر کھڑا ہو کر اُسے للکارنے لگے۔

☆

سوچ کا کارواں بڑھتا رہا۔

ہیلی کاپٹر ایک کے بعد ایک اُترتے اور اُڑتے رہے۔

سب سے پہلے محبوب رہنُما کا ہیلی کاپٹر اُترا اور سب سے آخر تک ہیلی پیڈ پر موجود رہا۔

شام کے سورج کے ساتھ والد صاحب کی نبض بھی ڈوب رہی تھی ۔محبوب رہنُما جیسے ہی بھیڑ کے قریب پہنچے۔نعرے بازی شروع ہوگئی ۔دھکّا مکّی بھی ہونے لگی ۔عمران بَٹ والد صاحب کو کاندھے پر لئے دھکّے پر دھکّے کھاتا رہا اور ہر دھکّے کے بعد پیچھے اور پیچھے ہوتا رہا۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ پاگلوں کی طرح آگے آنے کی کوشش کرنے لگا۔لیکن ہر بار اُس سے کچھ پوچھنے کے بعد پیچھے ڈھکیل دیا جاتا رہا۔

اور ایک بار پھر وہ سب سے پیچھے ہوگیا۔

اس کے محبوب رہنُما بھیڑ میں آئے بھی ۔اس سے ملے بھی۔اُس نے والد صاحب کی حالت بھی بتائی۔رویا اور پاؤں پکڑ کر گڑ گڑایا بھی۔ان کے قدموں پر والدِ محترم کو رکھ کر پاگلوں کی طرح چلایا بھی_____ لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔پاؤں چھُڑا کر جب وہ آگے بڑھ رہے تھے،تبھی والدِ محترم زور زور سے ہچکی لینے لگے تھے۔پولس والے دوڑ کر ان کے پاس آگئے۔

اس وقت عمران بَٹ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا..........

آخر کار اُڑان بھرنے سے پہلے محبوب رہنُما کو اس کی یتیمی پر رحم آ گیا۔وہ پاس آئے۔ والد کے مردہ جسم پر شال ڈالے۔اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ افسوس کا اظہار کیا.........اور پھر ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھتے ہوئے عمران بَٹ سے بڑی اپنائیت سے بولے۔

''سوری!تم تو اپنی پارٹی کے ہو۔دوسری پارٹی کا ایک بڑا نیتا پہاڑ کے اس طرف پھنسا ہوا ہے۔سیٹ صرف ایک خالی ہے ۔اُسے بچا لیتا ہوں تو پارٹی کی جیت کے ساتھ چیف منسٹر کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

ہیلی کاپٹر اُڑتے ہی آنکھوں کے سامنے سانپ سیڑھی کا کھیل گھوم گیا۔

☆☆☆

شہادت والی اُنگلی اور ٹریگر

پہلی شب دونوں کی زندگی میں خوشیوں کے ہزاروں رنگ بھر دے گی یہ نہ پدمنی نے سوچا تھا اور نہ ہی کیدار ناتھ نے۔ پدمنی اس لئے خوش تھی کہ اُسے ایسا گھر ملا ہے جہاں اُسے نہ کوئی بانجھ کہے گا اور نہ ہی بچّہ پیدا کرنی کی فرمائش۔ کیدار ناتھ اس لئے مسرور تھا کہ قسمت سے اُسے ایسی بیوی ملی ہے جو مردانگی پر انگشت نُمائی کر ہی نہیں سکتی۔

دونوں کی زندگی خوش رنگ سڑک سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک شب پدمنی کے جسم کی سونی کوٹھری میں کوئی دبے پاؤں آ گیا۔ وہ اس کے قدموں کی چاپ سے بے خبر خوابوں کی سیر کرتی رہی۔ لیکن جب حقیقت کے آسمان میں چمکتے ہوئے چاند کو دیکھا تو خوشی کی چاندنی اس کے چہرے پر چھٹک گئی۔ وہ اس چاند کو بادلوں کے آنچل میں چھُپا لینا چاہتی تھی۔ لیکن کب تک اور کہاں تک چھپاتی۔ ایک رات جب آسمان پر بادل کم پڑ گئے تھے اور چاند اپنی چاندنی بکھیرنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ کروٹیں بدل رہی تھی، خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی کہ چانک اندر ہلچل ہوئی اور وہ سیدھے باتھ روم کی طرف دوڑی۔ اس وقت کیدار ناتھ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ بھی کچھ سوچتے ہوئے باتھ روم کی طرف دوڑا تھا۔ لیکن جب اس نے پدمنی کو اُلٹی کرتے ہوئے دیکھا تو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔ ایسے میں آنکھوں کا سرخ ہونا اور دائرے سے الجھنا فطری عمل تھا۔

''تم بانجھ ہو، پھر ایسی اُلٹی......؟''

''کیدار......یہ بات.......مجھے بھی سمجھ میں.......نہیں آ رہی ہے۔'' پدمنی نے

خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''پدمنی! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟.......تم تو جانتی ہو کہ مجھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے ....'' کیدار ناتھ کی آواز میں اس وقت ایک نا ختم ہونے والے طوفان کا شور تھا جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک زوردار طمانچہ اس کے پھول سے گالوں پر جڑ دیا۔

''کیدار! میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں کہ میں نے ایسا ویسا کچھ بھی نہیں کیا ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑے دیر تک روتی رہی تھی۔

''پھر تمہارے پیٹ میں یہ شیطان کس کا ہے.......؟'' کیدار ناتھ نے اوپر کے دانتوں سے نیچے کے دانتوں کو اس طرح دبایا جیسے اس کے درمیان وہ دائرہ ہو۔

''اپنے ہی بچّے کو گالی مت دو کیدار۔''

بکواس بند کرو حرام خور! سچ سچ بتاؤ کہ تمہاری کوکھ میں یہ پاپ کس کا ہے؟''

''اگر یہ پاپ ہے تو پاپی تم ہو کیدار۔'' پدمنی نے اپنی آواز میں عورت کا سارا درد سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ پھر بھی کیدار ناتھ چیختا رہا۔

''پاپن! میرا نام اپنی زبان سے مت لو۔'' بال پکڑ کر اس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دوں۔ میں نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے۔'' وہ درد سے بلبلا اٹھی تھی۔

کیدار ناتھ نے چہرے پر تھوکتے ہوئے ایک طرف ڈھکیل دیا اور چیخا۔ پدمنی لڑکھڑاتے ہوئے بائیں طرف گر گئی اور دائیں طرف کی دیوار پر ایک جگہ چونے کا رنگ تازہ ہو گیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اور غصّہ تھا کہ بتدریج بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ کبھی دوسرے کو اور کبھی خود کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ بھی پدمنی کو مار دینا چاہتا تھا۔ تیزی سے دراز کی طرف بڑھا اور لائسینسی ریوالور نکال کر اس کی ہوس بھری نال پر پدمنی کی سانسوں کو ایک پل میں کانپتے پاؤں پر کھڑا کر لیا۔

''کمینی! اب تم بچ نہیں پاؤ گی۔'' دانت کچکچاتے ہوئے اس نے ٹریگر دبا دیا۔

پٹاخ کی آواز تو ہوئی لیکن پدمنی کے جسم میں کہیں دائرہ نہیں بنا۔ کیوں کہ اس میں گولی نہیں تھی۔ گولی دراز میں الگ سے رکھی ہوئی تھی۔ پھر وہ تیزی سے دراز کھول کر گولی تلاش کرنے لگا۔ سامان کو اوپر نیچے کرنے لگا۔ جب اس کے بعد بھی گولی نہیں ملی تو سامان کو فرش پر پھینکنا شروع کیا۔ اچانک اس کے ہاتھ ایک گولی لگ گئی۔ اس نے اسے بھر بھی لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ پدمنی کے جسم میں اسے خالی کرتا وہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔ رونے لگی تھی۔

''مجھے جان سے ماردو، لیکن پاپی مت کہو کیدار...... مجھے پاپی مت کہو...... میں پاپی نہیں ہوں...... میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا ہے......''

گولی بھرنے کے بعد جب کیدار ناتھ نے ریوالور کی نال کو اس کی طرف گھمایا تو ٹریگر پر انگلی کا دباؤ سخت پڑنے کے بجائے خود بخود ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ لیکن غصّہ تھا کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے بال پکڑا اور پوری طاقت سے پدمنی کو اپنی طرف کھینچا۔

''آج بچ گئی۔ لیکن کل جب ڈاکٹر کی رپورٹ تمہارے خلاف گواہی دے گی تو تم زندہ نہیں بچ پاؤ گی۔''

☆

انسان حال کی سرزمین پر جیتا ہے لیکن دل کی دھڑکنوں کے لئے ماضی سانس کا کام کرتا ہے۔ وہ سانس لینے کے لئے رکا تو پہلی بیوی للّی کے ساتھ گذارے ہوئے وہ چار سال آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے گھوم گئے۔ زندگی جب خلا بننے لگی تو آنکھوں کی دلکشی تاریکیوں کی نذر ہوگئی۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ بے رنگ ہوگیا۔ کیدار ناتھ ایسی زندگی سے وہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ایک ایسی دنیا کی طرف جہاں زندگی کی رنگینیاں ہوں۔ اس سڑک پر وہ اس امید پر آگے بڑھ رہا تھا کہ تھکنے سے پہلے کائنات کا کوئی بے رنگ ذرّہ زندگی میں ایسا رنگ بھر دے گا جو اس کے لئے سرمایۂ حیات بن جائے گا۔

ایک دن وہ اسی خواہش میں شہر کے مشہور و معروف سیکس اسپیشلسٹ ڈاکٹر پانڈے کی ڈسپنسری پہنچا جہاں معائینہ کی سہولتیات دستیاب تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنے

بعد وہ للّی کو بھی ڈاکٹر سے ملوائے گا۔ للّی تھی تو مشرقی عورت لیکن افزائش نسل کے متعلق اس کے خیالات مغربی عورتوں جیسے تھے۔ اسے اپنے حسن وشباب کا خیال تھا۔ وہ فوراً ماں بننا نہیں چاہتی تھی۔ دلہن بننے سے پہلے ہی اس نے پانچ سال کا ٹارگیٹ فکس کرلیا تھا۔ اس نے قبل از وقت ماں بننے والی لڑکیوں کا حشر دیکھا تھا۔ ازدواجی زندگی میں بندھنے کا مطلب صرف بچّہ پیدا کرنا نہیں، بلکہ زندگی کے حسین لمحے کو چرانا بھی ہے اور یہ وہی چرا سکتا ہے جسے اپنے حسن وشباب کی قدر ہو۔ کیدارناتھ کے موقف کو جاننے کے بعد بھی اس نے اپنے راز کو راز رکھا۔

دوسرے دن کیدارناتھ مقررہ وقت پر اپنی مردانگی کا رپورٹ لینے ڈاکٹر پانڈے کی ڈسپنسری پہنچا۔ ڈسپنسری میں بھیڑ تھی۔ انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون کے اس دور میں جہاں نئی نسل عریانیت کی چلتی پھرتی تصویری دکان میں جنسی تسکین کی حصولیابی کے لئے الگ الگ طریقہ کار اختیار کرتی ہے، وہیں جب نسوانی سکھ بھوگنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ سکھ کی تلاش میں سرگرداں ایسے ہی لوگوں کے لئے یہ ڈسپنسریاں زندگی کی نئی علامت ہیں۔ کیدارناتھ بھی اپنے کروزوم میں خود کو تلاش کرنے کی غرض سے یہاں آیا تھا۔

ڈاکٹر پانڈے کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وجہ نئی نرس تھی۔ جس کی خوبصورتی نے انہیں پاگل بنا دیا تھا۔ گذشتہ شب ڈسپنسری میں مسز پانڈے نے دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ پوری رات ڈاکٹر پانڈے کی آنکھوں میں کٹی تھی۔ نیند کے خمار سے آنکھیں بوجھل تھیں۔ بیوی کی سڑی سڑی گالیاں کانوں میں شیشے پگھلا رہی تھیں۔ بیوی نے جس طرح چوٹی پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے نرس کو باہر نکالا تھا وہ منظر بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ ڈسپنسری کھولنے کا دل بالکل نہیں تھا۔ لیکن مجبوری انہیں ڈسپنسری تک کھینچ لائی تھی۔ بیوی کی گالیوں سے بچ نکلنے کا راستہ بھی یہی تھا۔

کیدارناتھ کے سامنے چیک اپ کی رپورٹ رکھی ہوئی تھی جسے وہ اپنی لاش سمجھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ زندگی دلدل کی طرح لگ رہی تھی جس میں وہ آہستہ آہستہ دھنستا جا رہا تھا۔ جب کاندھے کے برابر تک وہ دھنس گیا تو خود کو دلدل سے نکالنے کے لئے ڈاکٹر

کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''پلیز ڈاکٹر! میرا ایک بار پھر سے ری چیک کرلیں تو......''

کیدار ناتھ کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر پانڈے نے اسے جھڑک دیا۔''پندرہ برس سے میں اس ڈسپنسری کو چلا رہا ہوں۔ بہت سارے کیسیز دیکھ چکا ہوں۔ کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ اب رہا تم جیسے لوگوں کا.......سب اپنی رپورٹ دیکھ کر یہی کہتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب پلیز ایک بار میرا ری چیک کرلیں۔''تیکھی ہنسی ہنستے ہوئے۔''بیر کے پیڑ میں کبھی سیب اُگتے ہوئے دیکھا ہے؟۔دوسری بار چیک اپ سے کیا تم مرد بن جاؤ گے۔میرا وقت برباد مت کرو۔رپورٹ اُٹھاؤ اور چلتے بنو۔''

کیدارناتھ کے سامنے اُمید کی ساری رنگینیاں معدوم ہوچکی تھیں۔شکستہ دل لئے وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹ رہا تھا۔قدم قدم پر سوالوں کا یلغار ہوتا۔وہ سہم جاتا کہ ''للّی کو معلوم ہوجائے گا تو پھر کیا ہوگا۔نفرت کرنے لگے گی۔اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔وہ اس بھری پُری دنیا میں سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہا رہ جائے گا۔''

رات سیاہ ہوچلی تھی۔قدم اور بھی بھاری ہوتے جارہے تھے۔لیمپ پوسٹ کی روشنی میں بھی اسے ساری چیزیں سیاہ نظر آرہی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔آنکھوں میں آنسوؤں کی مکڑی نے خون کے جالے بن دئے تھے۔ایسے میں اس نے فیصلہ کیا کہ جب اس کی اپنی نسل ہی دنیا نہیں دیکھ پائے گی تو پھر جینے کا کیا مطلب؟ وہ ایک خاص دکان کے پاس رکا اور سوچا کہ گھر جاتے ہی سر درد کا بہانہ کرے گا اور زہر کھا کر ایسی نیند سوئے گا کہ صبح ہوتے ہوتے بیوی کی ساری چوڑیاں خود بخود چٹخ پڑیں گی۔اس سوچ نے جیسے تیسے بڑی مشکل سے اسے گھر تک پہنچایا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا.......؟''

لِلّی نے اسے پریشان حال دیکھا تو پوچھا۔اس سوال پر اس کی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ایسا لگا جیسے للّی کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہو۔اس نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش

کی۔ کیسے بہانہ بنائے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔ اسے بھوک نہیں تھی۔ اس وقت اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی۔ للّی کھانا نکال رہی تھی اور وہ اسے خونی جالوں کے درمیان سے دیکھ رہا تھا۔ اس درمیان زہر کی وہ پڑیا بھی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی جسے لوٹتے وقت بازار سے خریدا تھا۔ اس وقت ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی جیسے وہ 'زہر' نہ ہو زندگی کی نئ 'علامت' ہو۔ لیکن جیسے ہی موت قریب ہوئی اس کے اندر جینے کی تمنا جاگ اُٹھی۔

کھانا کھانے کے دوران وہ سوچتا رہا کہ کس طرح للّی کو ڈائننگ روم سے باہر بھیجا جائے۔ اس نے سبزی میں نمک کم ہونے کا بہانہ بنایا تو للّی فوراً بول پڑی۔

''نہیں! نمک تو بالکل ٹھیک ہے۔''

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' کیدارناتھ غصّے سے اس کی طرف دیکھا اور شوہرانہ رعب گانٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب بیٹھی بیٹھی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔''

زندگی میں پہلی بار للّی نے محسوس کیا کہ اُسے پیار کرنے والا، ہر قدم پر اس کا خیال رکھنے والا، اس کی نزاکتوں کو برداشت کرنے والا کیدار ناتھ کا رویّہ آج بدلہ بدلہ سا ہے۔ لیکن اس وقت کچھ پوچھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے نمک لانے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اور اس دوران ناتھ نے بڑی صفائی سے للّی کے کھانے میں زہر ملا دیا۔

☆

سال گذر گیا اور کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔

وقت کے دھارے کے ساتھ انسان جب اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے تب بھی وہ کسی نہ کسی طرح جی ہی لیتا ہے۔ کیدارناتھ بھی جی رہا تھا۔ لیکن مر مر کر۔ وہ عورت ذات کو ہی بھول جانا چاہتا تھا۔ لیکن للّی کو بھولنے کی وہ جتنی کوشش کرتا اتنی ہی شدّت سے یاد آتی اور وہ بے چین ہو جایا کرتا۔ اور اب بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جس کے علاج کے لئے اسے ایک بار پھر عورت کی دوا ضرورتاً محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک دن دفتر سے لوٹتے وقت اس کی ملاقات بچپن کے ایک دوست سے ہوئی۔ دونوں ماضی کی کھٹی میٹھی باتیں کرتے دور نکل گئے تھے کہ تبھی سفید ساڑی میں سامنے سے آتی ہوئی ایک جوان عورت کے متعلق دوست نے بتایا۔

''نام پدمنی ہے۔ پانچ سال قبل اس کی شادی کسی دوسرے شہر میں کپڑے کے ایک بزنس مین سے ہوئی تھی۔ تین سال تک کی ازدواجی زندگی خوشگوار گذری۔ لیکن چوتھے سال بھی جب وہ اپنے آپ کو 'ماں'' کا درجہ دلانے میں ناکام رہی تو سسرال والوں نے شکم پر بانجھ کا لیبل چپکا کر اسے میکے بھیج دیا۔ بے چاری اب بوڑھے ماں باپ پر ایک بوجھ ہے۔''

پدمنی کے بارے میں جاننے کا اشتیاق جب مزید بڑھا تو اس کے دوست نے اس کے متعلق اور بھی باتیں بتائیں۔ کیدار ناتھ کی آنکھوں میں تارے جھلملاتے دیکھ کر دوست کو بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ کیدار ناتھ کو لے کر اسی وقت اس کے گھر پہنچا۔ پدمنی کے والدین بھی ایسے ہی کسی سنہری موقع کی تلاش میں اپنی بوڑھی آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔ ہفتے بھر کے اندر ہی شادی ہوگئی۔

☆

کیدار ناتھ ڈاکٹر پانڈے کی ڈسپنسری میں تھا۔ جہاں کل اس کے کروموزوم کا ایک بار پھر سے معائینہ کیا گیا تھا۔ کیا نہیں بلکہ پدمنی کو سبق سکھانے کے لئے دوبارا کروایا گیا۔ کیدار ناتھ اپنے ساتھ پدمنی کو بھی لے کر آیا تھا۔ دونوں الگ الگ کرسیوں پر مخالف رخ کئے بیٹھے تھے۔ پدمنی کی آنکھیں نم تھیں اور ایک انجانے خوف سے اس کا وجود لرز رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ ہونٹ بند تھے لیکن بند ہونٹوں کی صدائیں نیلی وسعتوں کا پردہ چاک کر رہی تھیں۔ ادھر کیدار ناتھ کی آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلے کو نمرود کی خدائی مل گئی تھی۔ اس نے آج بھگوان کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ بار بار پوچھ رہا تھا...... ''بھگوان تو نے مجھے ایسا بنایا کیوں کہ میری زندگی میں نا اُمیدی کے صحرا کے سوا کچھ بھی نہیں...... بولو بھگوان، بولو! چُپ کیوں ہو......؟ دن رات پوجا کرتا ہوں میں تیری اس لئے جواب تو دینا ہی ہوگا۔''

کیدار ناتھ غصّے سے کانپ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک بار اس کی

خشمگیں آنکھیں پدمنی کے شکم پر مرکوز ہوئیں تو سامنے غلیظ کیڑے کلبلانے لگے۔ بلاس فارنس میں پگھلے ہوئے لوہے کی طرح اس کا خون کھولنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ اسی وقت بدکار کا گلا دبا دے۔ پھر سوچا کہ رپورٹ آنے میں ابھی وقت ہی کتنا ہے۔ رپورٹ آتے ہی کورٹ کی جیب میں رکھا ہوا وفادار ریوالور اپنا کام بحسن وخوبی انجام دے دے گا۔

ڈسپنسری میں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ بار بار دونوں کی اضطرابی آنکھیں دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ جیسے ہی دروازہ کھلا دونوں ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ پدمنی کا دل بری طرح دھڑکنے لگا جیسے کوئی پمپ سے دل کے بلاڈر میں ہوا بھر رہا ہو۔ کیدار ناتھ کی حالت بھی پاگلوں جیسی تھی۔ چہرے کو پسینے نے ڈھک لیا تھا۔ ایک ہاتھ اب بھی کورٹ کی جیب میں غصّے سے کانپ رہا تھا۔

ڈاکٹر پانڈے کے ہاتھ میں رپورٹ تھی۔ کیدار ناتھ نے ان کی طنزیہ مسکراہٹ کا تجزیہ کیا تو اس کی سرخ آنکھیں اور بھی خون آلود ہو گئیں......کورٹ کی جیب میں حرکت ہوئی اور دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی ٹرائیگر پر آ کر رک گئی۔

کیدار ناتھ نے رپورٹ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر پدمنی کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خون آلود آنکھوں میں رپورٹ کی تحریریں آپس میں گڈمُڈ ہو کر للّی کی لاش میں تبدیل ہو گئیں۔ اس وقت اس کی حالت پاگلوں سے بھی بدتر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''پلیز ڈاکٹر! ایک بار پھر میرا ری چیک کر لیں تو......''

''دیکھو میں سترہ سال سے اس ڈسپنسری کو چلا رہا ہوں۔ کبھی کوئی غلطی........''

''پلیز ڈاکٹر!''

''تم پاگل تو نہیں ہو؟ رپورٹ ٹھیک ہونے کے بعد بھی ری چیک کی بات کر رہے ہو۔ جاؤ خوشیاں مناؤ۔''

''پلیز ڈاکٹر!''

اور پھر اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ ☆☆☆

انعامات راعزازات

(۱۵) **یو پی اردو اکادمی ایوارڈ۔ 2014**
برائے تخلیقی ادب۔ ناول ''لیمی نیٹیڈ گرل'' اشاعت دوم۔۲۰۱۴ء

(۱۴) **بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ۔ 2013**
برائے تخلیقی ادب۔ ناول ''لیمی نیٹیڈ گرل'' اشاعت اوّل۔۲۰۱۳ء

(۱۳) **یو پی اردو اکادمی ایوارڈ۔ 2011** افسانوی مجموعہ ''سونامی کو آنے دو'' کے لئے

(۱۲) **الومنی اعزاز۔ 2013**، ایم۔اے (اردو) ۱۹۹۱ء میں یونیورسٹی ٹاپ کرنے کیلئے
بدست، پرووائس چانسلر، رانچی یونیورسٹی، جھارکھنڈ

(۱۱) **بیسٹ کریٹیو فکشن رائٹر ایوارڈ۔ 2013**
بدست عزّت مآب عالی جناب ڈاکٹر سیّد احمد گورنر آف جھارکھنڈ

(۱۰) **''سعادت حسن منٹو ایوارڈ۔ 2012** ''ینگ ٹلینٹ فار اردو پروز''
(پہلا ایوارڈ) بدست: مرکزی وزیر، کپل سبّل، انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، دہلی

(۹) **شکیلہ اختر ایوارڈ۔ 2011** 'بہار اردو اکیڈمی
برائے تخلیقی ادب۔ افسانوی مجموعہ ''سونامی کو آنے دو'' کے لئے

(۸) **چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اعزاز: 2012**، بدست: وائس چانسلر، میرٹھ یونیورسٹی

(۷) **''حسن عسکری ایوارڈ'' 2007** بہار اردو اکیڈمی
برائے تصنیف ''منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ''

(۶) **ادارہ ''شائقینِ ادب'' اعزاز۔ 2011** (مجموعی خدمات کے سلسلے میں)

(۵) **منظر کاظمی پرائڈ آف پرفارمینس ایوارڈ۔ 2011**، اردو قبیلہ، جمشید پور

(۴) **شیلڈ آف آنر۔ 2010۔** بدست وائس چانسلر، میرٹھ یونیورسٹی

(۳) **ہم کلا سنگم ساہتیہ سمّان۔ 2009**، ہماچل پردیش، کہانی سنگرہ 'ہم کہاں جائیں....؟''

(۲) **''لدار چاسمّان'' ۲۰۰۶**، لاہول اسپیتی، ہماچل پردیش کی طرف سے

(۱) **بہار اردو اکادمی ایوارڈ۔ 2005** افسانوی مجموعہ ''ایک سمپورن انسان کی گاتھا''

☆ **پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ ''اختر آزاد کی افسانہ نگاری: تحقیقی وتنقیدی جائزہ''**
ریسرچ اسکالر: محمد عرفان کوثر۔ نگراں: ڈاکٹر زین رامش، ہزاری باغ یونیورسٹی، جھارکھنڈ

☆ **پی ایچ ڈی: ایک اور مقالہ۔** میری کتاب **'منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ'** پر (روشن آرا، رانچی)

☆ **ایم فل کے لئے۔** افسانوی مجموعہ **''ایک سمپورن انسان کی گاتھا''** (فرحین کوثر، جے۔این۔یو، دہلی)

☆ **خصوصی گوشہ : ناول ''لیمی نیٹیڈ گرل'' پر رسالہ 'امیدِ سحر''** (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء)

☆ **''تحریریں''** (اردو، ہندی، انگریزی میں میرے افسانوں پر بیس مضامین) 'ادبی چوپال' نے شائع کیا

☆ افسانہ **''چھتری''** کولہان یونیورسٹی، جھارکھنڈ، ایم۔اے کے نصاب میں شامل

☆ **افسانہ 'شوٹ آوٹ'** نئی صدی کے افسانے (عالمی انتخاب۔ (2015)) پروگریشیو اردو رائٹرز گلڈ، پاکستان

☆ **بیوٹی فکیشن (ہندی)** ''سمکالین بھارتیہ ساہتیہ'' **(بھومنڈلی کرن ویشیا نک)** ساہتیہ اکادمی، دہلی
تیرہ زبان کی کہانیوں میں اردو کی طرف سے شامل

☆ **برف پگھلے گی**، انتخاب، سمکالین ہندی یووا کہانی، گتی پرگتی، جلد اوّل -2009، ساہتیہ بھون، الہ آباد